مطالعہ افکارِ مغرب

دہم

جدید الحاد: یورپی تصورِ حیات کا فکری ثمر

ایک تعارف

محمد دین جوہر • محمد مبشر نذیر • حافظ محمد شارق

مطالعہ افکارِ مغرب

یورپی تصورِ حیات کا فکری ثمر: جدید الحاد

اِلحاد

ایک تعارف

محمد دین جوہر ● محمد مبشر نذیر ● حافظ محمد شارق

نام کتاب: الحاد ایک تعارف

مصنفین: محمد دین جوہر • محمد مبشر نذیر • حافظ محمد شارق

سن طباعت: ۲۰۱۷ء

قیمت: 300/-

ترتیب مضامین

ہم عصر الحاد پر ایک نظر از محمد دین جوہر

الحاد جدید کے مسلم اور مغربی معاشروں پر اثرات از محمد مبشر نذیر

الحاد اور جدید ذہن کے سوالات از حافظ محمد شارق

ہم عصر الحاد پر ایک نظر

از

محمد دین جوہر

ہم عصر الحاد پر ایک نظر

دنیا کے ہر مذہب میں خدا کے تعارف، اس کے اقرار، اس سے انسان کے تعلق اور اس تعلق کے حامل انسان کی خصوصیات کو مرکزیت حاصل ہے۔ مختصراً، مذہب خدا کا تعارف اور بندگی کا سانچہ ہے۔ جدید عہد مذہب پر فکری یورش اور اس سے عملی روگردانی کا دور ہے۔ لیکن اگر مذہب سے حاصل ہونے والے تعارفِ خدا اور تصورِ خدا سے انکار بھی کر دیا جائے، تو فکری اور فلسفیانہ علوم میں "خدا" ایک عقلی مسئلے کے طور پر پھر بھی موجود رہتا ہے۔ خدا کے مذہبی تصور اور اس سے تعلق کے مسئلے کو "حل" کرنے کے لیے جدیدیت نے اپنی ابتدائی تشکیل ہی میں ایک "مجہول الٰہ" (deity) کا تصور دیا تھا جس کی حیثیت ایک فکشن سے زیادہ نہیں تھی۔ جدیدیت نے آدمی کو یہ مژدہ سنایا تھا کہ وہ اس مفروضہ "خدا" سے تعلق طے کرنے میں بھی آزاد ہے۔ جدیدیت نے خدا کے مذہبی تصور کا مکمل انکار کیا، لیکن ایک افسانوی اور عقلی ساختہ "خدا" کا تصور پیش کر کے خداپرستی اور آزادروی کا التباس باقی رکھا۔ اس طرح جدیدیت نے انسان کو مذہب سے لاتعلق ہونے کا راستہ اور جواز فراہم کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ صنعتی ترقی، صنعتی کلچر، جدید تعلیم، سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی کے پھیلاؤ، اور جدید سیاسی اور معاشی نظام نے خدا کے سوال کو بالکل ہی غیر اہم بنا دیا۔ جدید دنیا میں مذہب کے مطابق خدا کو ماننے والوں کی حیثیت اب پسماندہ ذہن اور کلچر رکھنے والے ریڈ انڈینز کی طرح ہو گئی ہے۔

الحاد سے عام طور پر خدا کا انکار مراد لیا جاتا ہے، اور دہریت اس کی فکری تشکیلات اور تفصیلات پر مبنی ایک علمی مبحث اور تحریک ہے۔ آج کی دنیا میں الحاد جدید فرد کی داخلیت میں مستحکم ہو گیا ہے اور دہریت ایک بڑی تحریک کی صورت اختیار کر گئی ہے جو خدا کو ماننے کے مذہبی عقیدے اور غیر مذہبی رویے کے خلاف جارحانہ لائحہ عمل رکھتی ہے۔ الحاد اور دہریت اب کوئی علمی یا عقلی مسئلہ نہیں رہا، بلکہ یہ ایک سماجی اور ثقافتی صورت حال بن گئی ہے، جس نے کہیں کہیں ایک تحریک کی شکل بھی اختیار کر لی ہے۔ اب دہریت اپنے پھیلاؤ اور دفاع کے لیے "تحریکی" ذرائع استعمال کر رہی ہے اور سیاسی طاقت اور سرمائے کی بڑی قوتیں اس کی پشت پر ہیں۔

دہریت کی تحریک میں شدت کی ایک بڑی وجہ اسلام ہے۔ مغربی تہذیب نے "ترقی" کے منصوبے کو آگے بڑھانے کے لیے انیسویں اور بیسویں صدی میں جدید کاری (modernization) کو عالمی سطح پر فروغ دیا، جس کا بنیادی ہدف باقی ساری دنیا کو مغرب اور یورپ کے نمونے پر تشکیل دینا تھا۔ اس منصوبے کے پیدا کردہ جدید سماجی اور ثقافتی حالات میں دنیا کے مذاہب بخارات میں تحلیل ہو گئے۔ مسلم دنیا میں جدید کاری کے منصوبوں کو جزوی کامیابی تو یقیناً ہوئی لیکن وہ اسلام کی بیخ کنی کرنے میں نہ صرف ناکام رہے، بلکہ انہیں ہر سطح پر مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ جو الحادی اور اباحتی مقاصد معاشی ترقی، سیاسی پالیسی اور ثقافتی تبدیلی سے بالواسطہ حاصل نہ کیے جا سکے، دہریت کی تحریک اب انہیں جعلی علوم، سیاسی دھونس اور معاشی دباؤ سے براہ راست حاصل کرنا چاہتی ہے۔

الحاد کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں لیکن ہماری ناقص رائے میں ان میں کم از کم تین اقسام اہم ہیں جن کو ہمارے کلچر اور معاشرے میں بھی زیر بحث لانا ضروری ہے۔ یہ اسباب (۱) عقلی، اور (۲) نفسی ہیں، اور یہ (۳) استعماری غلامی کے نتیجے میں بھی سامنے آئے ہیں۔

۱۔ الحاد کے عقلی اسباب

اگر الحاد کا مرکز ذہن ہو تو اس کے اسباب عقلی ہوتے ہیں، یا دوسرے لفظوں میں الحاد کے اسباب علمی اور عقلی ہوں تو اس کا مرکز ذہن ہوتا ہے۔ عقلی الحاد کا شجرہ نسب براہ راست یورپی تحریک تنویر سے مل جاتا ہے۔ جدید عہد انسانی ذہن کی ایک نئی ساخت سے پیدا ہوا ہے اور اس نئی ساخت کو مسلسل صیقل کر کے یہ عہد خود کو تسلسل دیتا ہے۔ جدید ذہنی ساخت میں ''جاننے'' کو مرکزیت حاصل ہے اور ''ماننے'' کا عمل معیوب و مطرود ہے۔ جس طرح سونا اور جاگنا انسانی شعور کا فطری اور معمول کا وظیفہ ہے، اسی طرح ''جاننا'' اور ''ماننا'' بھی انسانی شعور کا فطری معمول ہے۔ ''ماننے'' کی قیمت پر ''جاننے'' کی پرورش کرنا جدید انسان کے ساتھ خاص ہے۔ الحاد ایک جدید موقف کے طور پر اس نئی شعوری ساخت سے جنم لیتا ہے۔ انسانی شعور کی ساخت، اس کے دائرۂ کار، اس کی فاعلیت اور انفعالیت کے نادرست تناظر اور علم کے بارے میں سر تا سر غلط موقف کا براہ راست نتیجہ الحاد کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ دراصل انسانی شعور کے بارے میں مجموعی طور پر غلط موقف ہی الحاد کی بنیاد میں کارفرما ہے۔ جدید شعور کا وحی اور امکانِ وحی سے ارادی انکار اس کی سرشت میں بہت پختہ ہو چکا ہے، اور جو تاریخی سفر میں فی نفسہٖ علم کے انکار کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ امکانِ علم کے خاتمے کی صورت حال میں جدید انسان میں عقیدے کے خلاف ایک سماجی اور سیاسی شدت پیدا ہو گئی ہے۔ کسی بھی طرح کے ''مذہبی عقیدے'' یا ''نظریاتی موقف'' کی موجودگی جدید ذہن اور عقل کی المناک نارسائی اور غیر معمولی ناکامی کا استعارہ بن گیا ہے، کیونکہ جدید ذہن انسان سے عقیدہ چھین کر اسے کوئی ''علم'' دینے کے قابل بھی نہیں ہو سکا۔ اس مشکل سے نکلنے کے لیے جدید ذہن انسان کو پوسٹ ہیومن ہونے کی تھپکیاں دے رہا ہے۔ پوسٹ ہیومن کا سادہ مطلب انسان کو یہ باور کرانا ہے کہ اسے پیاس تو

بالکل بھی نہیں لگتی، بس برگر کی بھوک ہی لگتی ہے۔ پوسٹ ماڈرنزم کے احوال میں جدید انسانی شعور ملبے کا ڈھیر ہے، اور قرائن یہی بتا رہے ہیں کہ یہ دنیا کو بھی ملبے کا ڈھیر بنانے والا ہے۔ انسانی شعور کے فکری حاصلات اور علمی انتاجات تاریخی تحقق لازماً حاصل کرتے ہیں، اور جدید شعور کا یہ ملبہ تاریخی تحقق کی طرف تیز تر سفر میں ہے۔

جدید عقل وسائلِ شعور سے پوری طرح خود آگاہ ہے، اور "جاننے" کے عمل میں ان وسائل کا ناکافی ہونا اب عقل کے تجربے میں ہے۔ جدید عقل کو جس شے کے جاننے کا مسئلہ درپیش ہے یعنی کائنات، وہ اس کے حسی ادراک، وقوفی گھیر اور کمندِ فہم سے فزوں تر ہے، یعنی یہ کائنات اس کے تجربے اور ذہن دونوں کی سمائی سے زیادہ ہے۔ جدید انسان جاننے والے "فاعل" اور جانے گئے "مفعول" کی دوئی میں رہتے ہوئے علم کے قیام میں ناکام ہو چکا ہے، اور اب اس پیراڈائم سے دستبردار ہو گیا ہے۔ جدید انسان کا آخری سہارا اب وقوف اور فہم ہے اور اب وہ فہم کی تقدیس سے فاعل و مفعول کی دوئی اور ذہن و شے کی ثنویت کو پاٹنے کی کوشش میں ہے جس کا نتیجہ ایک شدید اور گہری موضوعیت کی صورت میں سامنے آ رہا ہے۔ جدید اور منہدم انسانی شعور خارج از ذہن کسی چیز کے امکانِ ادراک و علم ہی سے انکاری ہے۔

صرف جاننے کی پوزیشن پر کھڑے ہونے والے جدید شعور کا ایک بہت بڑا مسئلہ اقدار ہیں۔ خدا کو ماننے یا نہ ماننے کا موقف اپنی اصل میں "دی گئی اقدار" کو ماننے یا نہ ماننے کا مسئلہ ہے، اور "خدا" محض عنوان ہے۔ خدا کو ماننے کا "معنی" علمی نہیں ہے، اقداری ہے۔ خدا کا انکار یک بیک اقدار کا انکار بھی ہے۔ وجودِ باری کے انکار سے پیدا ہونے والے احوال میں انفرادی اور سماجی سطح پر اہوائی پسند ناپسند انسان کی اخلاقیات بن جاتی ہے۔ "جاننے" کے عمل میں اگر خدا غیر اہم، غیر ممکن اور غیر موجود ہے تو اقدار بھی غیر اہم، غیر ممکن اور غیر موجود ہیں۔

خدا پر یقین اقدار ہی کی سربلندی ہے، اور اس یقین کا مطلب بہت سادہ ہے۔ خدا اور اقدار کو مان کر انسان یہ اعلان کر رہا ہوتا ہے کہ نہ میں خود سے ہوں نہ خود کے لیے ہوں۔ اگر انسان اس غیر مذہبی اور فطری موقف کو مان لے کہ وہ نہ خود سے ہے، اور نہ خود کے لیے ہے، تو وہ ہدایت کا مخاطب بننے کی اہلیت سے متصف ہو جاتا ہے۔ جدید انسان کا موقف ہے کہ وہ خود سے ہے اور خود کے لیے ہے، اور اس کا سادہ معنی یہ ہے کہ اس نے انسان ہونے سے دستبرداری کا فیصلہ کر لیا ہے اور اسی کو پوسٹ ہیومن کہا جاتا ہے۔ جدیدیت انسان کے عین اسی موقف کا اظہار ہے جو اسے ایک خود مختار و خود مکتفی وجود قرار دیتی ہے، اور اس کا انسان رہنا اور انسان ہونا ممکن نہیں رہتا۔

"جاننا" انسانی شعور کی فاعلیت ہے اور "ماننا" اس کی انفعالیت۔ اگر "جاننا" انسانی شعور کا واحد فعل قرار دے دیا جائے، اور "ماننے" کی انفعالیت سے انکار کر دیا جائے تو انسانی شعور کی اساس فہم پر منتقل ہو جاتی ہے۔ فہم کی بنیاد پر بننے والا شعور بھی جدید ذہن ہی کی ایک قسم ہے، جو اپنے لب لباب میں مذہبی نہیں ہے۔ فہم ڈوبتے ہوئے جدید شعور کو تنکے کا سہارا ہے۔ "فہم" کے غلبے میں انسانی شعور کی انفعالیت کا انکار آسان ہو جاتا ہے، اور اقدار کی قبولیت او ان سے تعلق کمزور پڑ جاتا ہے، یہاں تک کہ "فہمی شعور" جلد یا بدیر اقدار سے منقطع ہو جاتا ہے۔ "جاننے" کا عمل اور "فہم" کی سرگرمی انسانی ذہن کو مکمل طور پر نیچرلائز کر دیتی ہے اور وہ مذہب کے ماورائی معانی کا مخاطب نہیں بن پاتا۔ اگر "جاننے" والے ذہن اور "فہم" میں نسبتیں گہری ہو جائیں تو ایسا شعور ایک ململی ردائے عقلی کی پٹی میں ملفوف ہو جاتا ہے جس میں خبرِ غیب بار نہیں پا سکتی۔ فہم کا بنیادی مقصد حیات ارضی میں موضوعیت اور معروضیت کی دوئی سے پیدا ہونے والی کھائی کو پاٹنا اور شعور کی سرگرمی کو بامعنی بنانا ہے۔ جدید "فہم" کا تعلق تجربی موضوعیت اور شہودی معروضیت سے ہے، اور غیب سے غیر متعلق ہے۔ ا

ـ۔ فہم پر زور دینے والا مذہبی ذہن بھی دراصل جدید ذہن ہی کی ایک شکل ہے۔

خا ص عقلی اور علمی بنیادوں پر الحاد تک پہنچنے والے ذہن اور افراد ہمارے ہاں بہت کم اور خا ل خال ہیں، کیونکہ الحادی علمی نتائج تک پہنچنے کے لیے ذہن کی آزاد فعلیت لازمی ہے۔ ہما رے ہاں تو فعلیت ہی نہیں ہے، آزاد فعلیت کیا ہو گی۔ لیکن بہر حال علم کی بنیاد پر بننے والے الحا دی ذہن کو engage کیا جا سکتا ہے۔ اس کی بنیاد خدا کے موجود یا غیر موجود ہونے کے "منطقی" دلائل نہیں ہوں گے بلکہ اس کی بنیاد انسانی شعور کی ساخت، اس کے مجموعی ادراکی اور علمی وسائل، شعور اور علم کا باہمی تعلق اور شعور کے داخلی اور فطری اقتضآت ہوں گے۔ اگر انسانی شعور کے کل وسائل کو حتمی تو کجا کافی بھی ثابت کیا جا سکے تو الحاد کا موقف قابل غور ہو سکتا ہے۔ ہماری گزارش ہے کہ "علم" کے حصول کے لیے انسانی شعور کے وسائل حتمی تو یقیناً نہیں ہیں، ان کو کافی ثابت کرنا بھی ممکن نہیں۔ پھر جدید ذہن کے "کارناموں" کا اس کے اپنے قائم کردہ علمی تناظر میں تجزیہ بھی ضروری ہے۔ جدید ذہن اپنے انکاری علم، آلاتی انـ قیات اور فطرت ارضی پر غلبے سے جس طرح کی دنیا تشکیل دے چکا ہے وہ انسانوں کے رہنے کے قابل نہیں رہی، اور اس کے لیے پوسٹ ہیومن نامی ایک نئی آرگنزم بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے جو حیوان اور مشین کا مجموعہ ہو گی۔ جدید ذہن اپنی ہی بنائی ہوئی جنت ارضی میں محصور ہو کر وسائل حیات کو بھی معرض خطر میں ڈال چکا ہے۔ جدید ذہن کے کارنامے اور کرتوت اس کے کھاتے میں رکھ کر ہی اس کے موقف کو زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔ ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ ہمیں جدید ذہن کے کارنامے تو ازبر ہیں، کرتوت معلوم نہیں، اس لیے بات شروع ہونے سے پہلے ہی دسترس میں آ جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں روایتی عقلی علوم کے خاتمے اور جدید عقلی اور نظری علوم سے عدم واقفیت کی وجہ سے الحاد کا سامنا کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ جدید الحادی عقل کا سامنا جدید مذہبی عقل سے ہی کیا جا سکتا ہے، اور مذہبی

مرادات پر جدید عقل کی نظری اور فکری تشکیل ہمارے ہاں نامعلوم ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہماری متداول مذہبی روایت عقل اور علم کی دشمنی کو مذہبی ذمہ داری کے طور پر فروغ دے رہی ہے، اور جدید الحادی عقل کے سامنے کھڑے ہونے کی داخلی کوششوں کو نہ صرف شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے بلکہ ان کے خلاف صف آرا بھی ہے۔ اس صورت حال میں جدید عقلی الحاد تعلیم یافتہ مسلمانوں میں وبا کی طرح پھیل رہا ہے اور مسلمانوں کے لیے اس کا سامنا کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

۲۔ الحاد کے نفسی اسباب:

اگر الحاد کے اسباب نفسی ہوں تو اس کا مرکز طبیعت ہوتی ہے، جسے درست تر معنی میں دہریت کہا جاتا ہے۔ الحاد کے نفسی اسباب پر ہمارے ہاں گفتگو معدوم ہے۔ عقلی اسباب کی نسبت جدید عہد میں الحاد کے نفسی اسباب کی کثرت ہے۔ ان کا تجزیہ دقتِ نظر کا متقاضی ہے اور ان کا توڑ بھی زیادہ مشکل ہے، کیونکہ عقلی الحاد صرف ذہنی ہوتا ہے جبکہ نفسی الحاد وجودی ہے۔ نفسی الحاد کے "وجودی" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ذہن اور شعور کے احوال انکار پر ہوتے ہیں اور نفس کے احوال بغاوت پر ہوتے ہیں، اور ارادہ ہوا کے تابع ہوتا ہے۔ مناسب تیاری کے بغیر، مذہبی آدمی کے لیے انکار اور بغاوت کا بیک وقت سامنا کرنا مشکل ہے۔ الحاد کے نفسی احوال میں علم اور اقدار کا التباس بہت عام ہے لیکن یہ بنیادی طور پر ایک psychic condition اور مزاج ہے۔

الحاد کے نفسی اسباب کا شجرہ نسب براہِ راست یورپی رومانویت کی تحریک سے مل جاتا ہے۔ ہمارے ہاں رومانویت کی تحریک کے جو اثرات مرتب ہوئے، وہ کسی علمی اور فکری تجزیے کا موضوع نہ بن سکے۔ مغرب میں پیدا ہونے والی رومانوی تحریک کے اظہارات صرف ادب اور فنون وغیرہ تک محدود نہیں ہیں۔ مغربی رومانویت کے طاقتور ترین مظاہر یورپ کے سیاسی

عمل میں سامنے آئے ہیں۔ تحریک تنویر سے جڑے ہوئے سیاسی عمل میں مرکزیت "ریفارم" کو حاصل تھی، جبکہ رومانویت سے جڑے ہوئے سیاسی عمل میں مرکزیت "انقلاب" کو حاصل ہے۔ "ریفارم" کے لیے عقل کی ضرورت پڑتی ہے، جبکہ "انقلاب" کے منہ زور اور سینہ زور طبیعت اور بے دماغی کافی ہوتی ہے۔ تحریک تنویر ماضی اور روایت سے بنی ہوئی دنیا کو "ریفارم" کے عمل سے ختم کرنا چاہتی تھی، جبکہ رومانویت اس کو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کرتی اور "انقلاب" کے ایک ہی ہلے میں اسے مٹا دینا چاہتی تھی۔

اس تناظر میں دیکھیں تو ہم اپنے استعماری تجربے کی وجہ سے اس وقت ایک بہت بڑے تہذیبی تذبذب اور علمی اشکال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں "مذہبی سیاست" کی پوری شناخت، عمل اور طریقۂ کار مغرب کی سیاسی رومانویت کا انتہائی گھٹیا چربہ ہے۔ جمہوریت، تنظیمی ریاست، قانون سازی، حقوق انسانی کے جدید تصورات، سیاسی ریفارم، معاشی ترقی ،غیرہ مغرب کی غیر رومانوی سیاسی فکر کے نتائج اور اس کا ایجنڈا ہیں، جبکہ انقلاب مغربی سیاسی رومانویت کا معبد اعظم ہے۔ ہمارے ہاں بھی مذہبی سیاست بنیادی طور پر "تحریکی" اور "انقلابی" نوعیت کی ہے، جو مکمل طور پر مغربی رومانویت کی نقل ہے۔ ہمارے ہاں مذہبی سیاسی رومانویت نے تاریخی شعور، دینی روایت اور عقلی علوم کا بالکل صفایا کر دیا ہے، اور پوری دینی روایت کی تشکیل نو عامیانہ فہم اور استعماری جدیدیت پر مکمل کر لی ہے، جس نے دینی روایت کے تہذیبی تناظر کو بالکل فنا کر دیا ہے۔ ہمارے ہاں "مذہبی" بنیادوں پر جمہوریت کے خلاف زیادہ تر مواقف سیاسی رومانویت سے حاصل ہوئے ہیں۔ ان کی بنیاد نہ استنادی ہے اور نہ عقلی اور ان کا مذہبی یا غیر مذہبی ہونا محض التباس ہے۔ رومانوی الاصل ہونے کی وجہ سے ہمارے ہاں "مذہبی سیاست" کا پورا مبحث اخلاقی بیانات کا مجرب مجموعہ، تاریخی شعور

سے عاری اور سیاسی ادراک سے بالکل تہی ہے۔ "مذہبی سیاسی کلچر" میں پروان چڑھنے والی طبیعت الحاد اور دہریت کا تر نوالہ ہے۔ رومانوی مذہبی تصورات پر کیے گئے سیاسی تجربے میں ناکامی کا غالب رجحان الحاد اور دہریت کی طرف پھر جاتا ہے۔

تحریک تنویر، مذہب اور خدا کے مذہبی تصور کے روبرو عقل کے موقف انکار کو سامنے لاتی ہے۔ رومانویت انکار نہیں ہے۔ تنویری عقل نے خدا کے انکار کے بعد خود خدا کی جگہ پر قبضہ جمانے کی کوشش کی تھی اور یہ ابھی سکون سے بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ اس کے اپنے حرم میں بلوہ ہو گیا۔ رومانویت دراصل تنویری عقل کا انکار نہیں، اس کے خلاف بغاوت ہے۔ رومانویت اور انقلابیت مجسم بغاوت ہے جس میں انکار بائی ڈیفالٹ شامل ہے۔ رومانویت کی وجودی پوزیشن پر کھڑے ہو کر مذہب تو دور کی بات ہے عقل کا اثبات بھی ممکن نہیں ہوتا۔ رومانویت کسی عقل، دلیل، روایت، کسی اخلاقیات، کسی فلسفۂ حیات، کسی تاریخ، کسی تقدیر وغیرہ کو نہیں مانتی، پس یہ اپنا راستہ چاہتی ہے، کیونکہ اس کے نزدیک "ہونے" کا سب سے بڑا اظہار غضب (wrath) ہے۔ رومانویت کی سرشت میں فاگندھی ہوئی ہے اور یہ اپنی فنا سے پہلے انسان کو، اس کے معاشرے کو، تاریخ کو، فطرت ارضی کو، اور بس چلے تو پوری کائنات کے بخیے اُدھیڑ کے ان کو اپنی مرضی کے مطابق نئے سرے سے بنانا چاہتی ہے تا کہ اپنے نئے روپ میں یہ سب چیزیں اس کے سامنے سربسجود ہو جائیں۔ رومانویت نفس انسانی کی ایک ایسی نئی تشکیل ہے جس میں عبد و معبود یکجا ہے، یعنی رومانوی انسان کی تحلیل ذات ایسی ہے کہ وہ ساجد و مسجود خود ہی ہے، اور "عظمت انسانی" کے لیے "شہید" ہونا اس کی بنیادی رسومیات میں شامل ہے۔

رومانویت اپنا تحقق عمل پیہم میں حاصل کرتی ہے جو سونامی صفت ارادے سے تحریک پاتا ہے اور آخر کار انقلاب پر منتہی ہوتا ہے۔ رومانویت وجود انسانی میں آئے ہوئے مستقل

بھو پال کی طرح ہے اور یہ خود میں جل کر اور اپنے گرد و پیش کو جلا کر اپنا تحقق کرتی ہے۔ رومانویت کا چیزوں سے تعلق جاننے یا فہم وغیرہ کا نہیں ہے بلکہ یہ تعلق براہ راست غلبے اور فنا کا ہے۔ عقل، مذہب، اخلاقیات، فلسفہ وغیرہ رومانوی ترتیب میں کوئی معنی نہیں رکھتے۔ رومانویت میں راستہ پہلے سے نہیں ہوتا، ارادے سے پیدا ہوتا ہے اور علم بھی ارادے سے پھوٹتا ہے۔ ادبی اور ثقافتی رومانویت نفسی خود مختاری کی علم بردار ہے جبکہ سیاسی رومانویت انقلاب پسند ہوتی ہے۔ رومانوی تصورات پر تشکیل پانے والی انسانی شخصیت مذہب یا خدا کا انکار نہیں کرتی کیونکہ انکار بھی اسے اہمیت دینے کے مترادف ہے۔ عقلی الحاد ایک پہلے سے موجود اثبات کے روبرو انکار کا رویہ ہے۔ رومانویت اثبات و انکار ہی سے لاتعلق ہوتی ہے۔ عصر حاضر میں الحاد اور دہریت کا غالب سانچہ رومانویت ہے جسے دنیا کو تبدیل کرنے کے عظیم الشان سائنسی اور سیاسی منصوبے کی پشتیبانی حاصل ہے۔ رومانوی آدمی فطرت اور تاریخ کے خلاف جنگ میں خود کو ایک بطل جلیل کے طور پر دیکھتا ہے اور مذہب وغیرہ کو خاطر میں لانا بھی سرِ شان سمجھتا ہے۔

رومانوی الحاد کے نفسی اسباب میں ایک بہت بڑی وجہ فطری اخلاقیات کی مرکزیت ہے۔ یہ اخلاقیات بوقت ضرورت رومانوی ارادے کے لیے دستانے کا کام کرتی ہے، اور دیکھنے میں خوشنما، اپنی اصل میں آلاتی اور مذہب پر ضرب میں کاری ہوتی ہے۔ تحریک تنویر نے مذہب کے خاتمے اور اس کے تصور خدا سے نجات کے لیے ایک افسانوی "الہ" کا تصور عام کیا تھا، اور حق و باطل کے مذہبی تصورات ہی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ رومانویت نے مذہب کو اخلاقیات کا ناقص مجموعہ قرار دیا اور اس کے مقابلے میں ایک فطری اور آفاقی اخلاقیات کا تصور دیا۔ تنویری عقل، عقلی تصورات کو مذہبی تصور خدا پر حکم سمجھتی ہے۔ رومانوی انسان فطری اخلاقی تصورات کو مذہبی تصور خدا پر حکم خیال کرتا ہے۔ دونوں کا مقصد مذہب اور مذہبی

تصور خدا کورد کرتا ہے۔

گزارش ہے کہ جدید علمی مواقف کی رسائی محدود ہے، اور وہ مذہب پر کاری ضرب لگانے کے باوجود اسے مکمل طور پر ختم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ لیکن جدید رومانوی اخلاقیات اپنے ہر ہر پہلو میں زیادہ مؤثر بھی ہے اور مسموم بھی۔ جدید انسان پر رومانوی اخلاقی شعور کا غلبہ انکاری علم سے زیادہ خطرناک ہے، اور مذہب اپنی جدید تعبیرات میں بہت تیزی سے اس کے سامنے ہتھیار ڈال رہا ہے۔ اخلاقی شعور "درست" اور "غلط" میں ظاہر ہوتا ہے۔ مذہب میں اخلاقی شعور "حق" اور "باطل" کے تصور کے تابع ہے۔ اگر حق و باطل کا احساس اور اک باقی نہ رہے، اور اخلاقی شعور کا غلبہ ہو جائے تو "دجل" کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔ مذہبی شعور میں حق و باطل کا دائرہ مابعد الطبیعیاتی، تہذیبی اور تاریخی ہے۔ فطری اخلاقیات رومانوی شعور کی مابعد الطبیعیات ہے۔ رومانوی شعور نے اخلاقیات کو تہذیبی اور تاریخی دائروں تک وسعت دے کر مذہب کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا ہے، اور الحاد ایک ثقافتی مظہر کے طور پر عام انسانی زندگی پر مؤثر ہو گیا ہے۔ رومانوی الحاد اور دہریت سے گفتگو کے لیے مذہبی آدمی کو نہایت تنگ اور محدود جگہ میسر ہے، جو ہمارے خیال میں یہ سوال ہے کہ "انسان ہونے سے کیا مراد ہے؟" رومانوی دہریت میں فطری اخلاقیات ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ کے طور پر شامل ہے اور اس سوال کے ضمن میں رومانوی انسان کے نفسی احوال اور اس کی اخلاقیات کو زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔

الحاد کے عقلی اور نفسی اسباب کا تجزیہ کرنے سے بعد ایک اعادہ ضروری ہے۔ عقلی الحاد کا سامنا کرنے کے لیے نظری علوم ضروری ہیں، تاکہ وسائل فراہم ہوں اور یہ بھی معلوم ہو کہ لڑائی کا میدان کہاں ہے۔ اب تو ہماری حالت یہ ہے کہ لڑائی کے لیے نکلتے ہیں اور سیدھے گھر کے تہہ خانے میں پہنچ جاتے ہیں اور اپنے ہی نعروں اور ان کی گونج کو سن کر فاتحانہ لوٹتے

ہیں۔ اسی طرح نفسی الحاد کا سامنا کرنے کے لیے عرفانی سلوک کی نئی ترتیب لازم ہے کیونکہ نفسی الحاد کا مقابلہ صرف عقلی علوم سے نہیں کیا جا سکتا۔ نفسی اور رومانوی الحاد میں ذہن اور طبیعت کو بیک وقت مخاطب کرنا ضروری ہے جس کا واحد ذریعہ عرفانی سلوک ہے۔ نظری علوم کے بغیر عقلی الحاد کا اور عرفانی سلوک کے بغیر نفسی الحاد کا مقابلہ کرنے کا منصوبہ محض خام خیالی ہے۔ ہمارے ہاں جدید تعلیم اور دین کی جدید استعماری تعبیرات نے جس طرح عقلی الحاد کو فروغ دیا ہے، بعینہٖ ہمارے ثقافتی تصوف اور شعبدہ جاتی سلوک نے نفسی الحاد اور شرک کو وبا کی صورت دے دی ہے۔ اور ان کا تجزیہ اور تزکیہ لازم و ملزوم ہیں۔ یہاں ضمناً ایک بات عرض کرنا ضروری ہے کہ رومانویت میں الحاد اور شرک کے امکانات یکساں موجود ہوتے ہیں۔ جدید عقل نے تو صرف شعور پر غلط موقف کو فروغ دیا ہے، جبکہ رومانویت شعور اور وجود دونوں کے بارے میں غلط موقف پر کھڑی ہوتی ہے۔ عرض ہے کہ جدید دنیا کے گھمسان میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی کا کام آج بھی درپیش ہے، اور ہم اس کی تیاری سے بالکل غافل ہیں۔

3۔ استعماری غلامی بطور منبع الحاد

جدید استعماری عہد میں غلامی اور محکومی میں فرق کرنا ضروری ہے۔ سیاسی طاقت سے مغلوبیت، محکومی ہے۔ محکومی میں خود شعوری کی حالت باقی رہتی ہے، اور یہی خود شعوری ایک تاریخی اور سیاسی ادراک میں ڈھل کر مزاحمت کا راستہ ہموار کرتی ہے۔ محکومی ایک سیاسی مظہر ہے جبکہ غلامی ایک تہذیبی مظہر ہے۔ غلامی میں محکومی کا شعور باقی نہیں رہتا، اور کیونکہ وہ ایک مفید مطلب معروف کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ مزاحمت کی شرط اول محکوم کی تہذیبی شناخت کا باقی رہنا ہے، اور مزاحمت اسی شناخت کو باقی رکھنے یا اس کی بازیافت کا عمل ہے۔ محکومی میں شناخت کے تہذیبی وسائل علمی روایت سے فراہم ہوتے ہیں۔ ان

وسائل سے انقطاع غلامی کا بڑا سبب بنتا ہے۔ ایسی صورت حال میں محکوم، حاکم سے شناخت کی عینیت پیدا کر کے غلامی میں داخل ہو جاتا ہے۔ حاضر و موجود سیاسی طاقت کا جبر محکوم میں تاریخی انقطاع کا باعث بنتا ہے اور تاریخ کسی ولولے کا منبع نہیں رہتی بلکہ عار بن جاتی ہے۔ دینی روایت سے ملنے والے ملی شعور اور تاریخی شعور کا بیک وقت خاتمہ غلامی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

گزارش ہے کہ انسانی معاشرہ جن اقدار پر قائم ہوتا ہے، سیاسی طاقت اس معاشرے کی شہر پناہ اور ان اقدار کی محافظ ہوتی ہے۔ سیاسی طاقت ختم ہوتے ہی بیرونی غلبے میں معاشرہ اقدار کے بحران کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر یہ بحران گہرا ہو تو محکوم معاشرہ بیرونی سیاسی طاقت سے تہذیبی عینیت پیدا کرنا شروع کرتا ہے۔ برصغیر میں مسلم معاشرہ استعماری دور میں اپنی تہذیبی شناخت اور ورلڈ ویو کو باقی نہیں رکھ سکا۔ اس وجہ سے مسلم ذہن تاریخی اور دینی روایت کے وسائل سے محروم ہو کر عصری تاریخ سے بھی کوئی بامعنی تعلق پیدا نہ کر سکا۔

عقیدے اور اقدار کا تاریخ اور معاشرے سے تعلق دو سطحوں پر ظاہر ہوتا ہے، ایک کردار میں اور دوسرے علم میں۔ کردار قدر اور تاریخ میں فاصلہ نہیں پیدا ہونے دیتا، اور علم ذہن کو تاریخ اور معاشرے سے حالت انکار میں جانے پر روک لگاتا ہے۔ ہمارے ہاں روایتی علوم کے خاتمے اور جدید علوم سے لاتعلقی نے ہمارے عقیدے اور اقدار کے پورے نظام کو متحجر بنا دیا ہے۔ عقیدے کی حفاظت بھی علوم کی زندہ روایت میں رہ کر ممکن ہوتی ہے۔ اقدار اگر تاریخ سے غیر متعلق ہو جائیں تو کلچر کے میوزیم میں داخل ہو جاتی ہیں۔ ان کو صرف کردار اور نظری علوم کے ذرائع سے ہی تاریخ سے متعلق رکھا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں دینی کردار کے مظاہر میں لزوی اور نظری علوم کے خاتمے نے جدید تعلیم کو الحاد کا سب سے بڑا ذریعہ بنا دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہماری اقدار اور تاریخ میں فاصلہ بہت بڑھ گیا ہے

...ر وہ ہم عصری دنیا کے لیے اجنبی ہو چکی ہیں۔ جب اقدار اور تاریخ میں فاصلہ زیادہ ہو جائے تو اسے پاٹنے کے لیے ثقہ علوم اور کردار کی ضرورت شدید ہو جاتی ہے۔

استعمار کے معاشی اور سیاسی غلبے، جدید کلچر اور تعلیم نے ہماری تہذیبی اور دینی روایت کو مجروح کیا، اور ہمارے جدید ذہن کی تعمیر میں بھی مرکزی کردار ادا کیا۔ ہمارے ذہن کی بنیادی ساخت استعمار اور اس کے "احکامات" اور "تعلیمات" سے متوارث ہے۔ یہ ذہن اپنے آپ کو، معاشرے اور تاریخ کو، اور کائنات کو اپنی کسی بھی شرط پر دیکھنے کی اہلیت نہیں رکھتا کیونکہ یہ خود ہی نہیں ہے، شرط کیا ہو گی۔ یہ بس چیزوں کے "دکھوائے" جانے پر راضی ہے، اور اس "دِکھوائی" پر ڈھلتے چلے جانا اس ذہن کی سب سے بڑی آرزو ہے۔ اور "دکھوانے" کا یہ کام بھی ابھی تک انہی لوگوں کے پاس چلا آتا ہے جنھوں نے اس ذہن کی تشکیل کی ہے۔ ہمارے ہاں الحاد اور دہریت اس عمل کا نتیجہ ہے جو اب خود کار ہے۔

الحاد جدید کے مسلم اور مغربی معاشروں پر اثرات

از

محمد مبشر نذیر

باب:1

الحاد کی تعریف

اللہ تعالیٰ نے جو آسمانی ہدایت اس دنیا کو عطا فرمائی وہ بنیادی طور پر تین عقائد پر مشتمل تھی: یعنی توحید، نبوت و رسالت اور آخرت۔ اس کا خلاصہ یہ ہے اس کائنات کو ایک خدا نے تخلیق کیا ہے۔ تخلیق کرنے کے بعد وہ اس کائنات سے لاتعلق نہیں ہو گیا بلکہ اس کائنات کا نظام وہی چلا رہا ہے۔ اس نے انسانوں کو اچھے اور برے کی تمیز سکھائی ہے جسے اخلاقیات (ethics) یا دین فطرت کہتے ہیں۔ مزید برآں اس نے انسانوں میں چند لوگوں کو منتخب کر کے ان سے براہ راست خطاب کیا ہے اور انہیں مزید ہدایات دی ہیں جن کے مطابق انسانوں کو اپنی زندگی گزارنا چاہئے۔ انسان کی زندگی موت پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اسے دوبارہ ایک نئی دنیا میں پیدا کیا جائے گا جہاں اس سے موجودہ زندگی کے اعمال کا حساب، کتاب لیا جائے گا۔ جس نے اس دنیا میں دین فطرت اور دین وحی پر عمل کیا ہو گا، وہ خدا کی ابدی بادشاہی یا جنت میں داخل ہو گا اور جس نے اس سے اعراض کیا، اس کا ٹھکانا جہنم ہو گا۔

الحاد کا لفظ عموماً لادینیت اور خدا پر عدم یقین کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک اوپر بیان کئے گئے تینوں عقائد ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کا انکار یا اس سے اعراض باقی دو کو غیر موثر کر دیتا ہے اس لئے ان میں کسی ایک کا انکار بھی الحاد ہی کہلائے گا۔ چنانچہ اس تحریر میں ہم جس الحاد کی تاریخ پر گفتگو کریں گے وہ وجود

خدا، نبوت و رسالت اور آخرت میں سے نظریاتی یا عملی طور پر کسی ایک یا تینوں کے انکار پر مبنی ہے۔ ہماری اس تحریر میں الحاد کی تعریف میں مروجہ Atheism, Deism اور Agnosticism سب ہی شامل ہیں۔

زمانہ قدیم سے ہی بعض لوگ الحاد کے کسی نہ کسی شکل میں قائل تھے لیکن اس معاملے میں خدا کے وجود کا انکار بہت ہی کم کیا گیا ہے۔ بڑے مذاہب میں صرف بدھ مت ہی ایسا مذہب ہے جس میں کسی خدا کا تصور نہیں پایا جاتا۔ ہندو مذہب کے بعض فرقوں جیسے جین مت میں خدا کا تصور نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ دنیا بھر میں صرف چند فلسفی ہی ایسے گزرے ہیں جنہوں نے خدا کا انکار کیا۔ عوام الناس کی اکثریت ایک یا کئی خداؤں کے وجود کی بہر حال قائل رہی ہے۔ نبوت و رسالت کا اصولی حیثیت سے انکار کرنے والے بھی کم ہی رہے ہاں ایسا ضرور ہوا کہ جب کوئی نبی یا رسول ان کے پاس خدا کا پیغام لے کر آیا تو اپنے مفادات یا ضد ہٹ دھرمی کی وجہ سے انہوں نے اس مخصوص نبی یا رسول کا انکار کیا ہو۔ آخرت کا انکار کرنے والے ہر دور میں کافی بڑی تعداد میں دنیا میں موجود رہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے مشرکین کے بارے میں بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ خدا کے منکر تو نہ تھے لیکن ان میں آخرت پر یقین نہ رکھنے والوں کی کمی نہ تھی۔

عالمی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خالص الحاد دنیا میں کبھی قوت نہ پکڑ سکا۔ دنیا بھر میں یا تو انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کے ماننے والے غالب رہے یا پھر دین شرک کا غلبہ رہا۔ دین الحاد کو حقیقی فروغ موجودہ زمانے ہی میں حاصل ہوا ہے جب دنیا کی غالب اقوام نے اسے اپنے نظام حیات کے طور پر قبول کر لیا ہے اور اس کے اثرات پوری دنیا پر پڑ رہے ہیں۔ اس تحریر میں ہم یہ جائزہ لینے کی کوشش کریں گے کہ وہ کیا عوامل تھے جن کی بنیاد پر الحاد کو اس قدر فروغ حاصل ہوا؟ دنیا بھر میں الحاد کی تحریک نے کیا کیا فتوحات حاصل کیں اور اسے

قبول کرنے والے ممالک اور اقوام کی سیاست، معیشت اور معاشرت پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟ تاریخ کے مختلف ادوار میں الحاد کی تحریک نے کیا کیا رنگ اختیار کئے اور دور جدید میں الحاد کی کونسی شکل دنیا میں غالب ہے؟ مغربی ممالک کے ساتھ ساتھ مسلم ممالک پر اس کے کیا اثرات مرتب ہو چکے ہیں اور اس کے مستقبل کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟

باب: 2

یورپ میں الحاد کی تحریک

یورپ عیسائی عہد میں

یورپ میں قرون وسطی ہی میں عیسائی حکومتیں قائم ہو چکی تھیں اور چرچ کا اثر پوری طرح مستحکم ہو چکا تھا۔ جب تیسری صدی عیسوی میں عوام الناس کی اکثریت نے عیسائیت قبول کرلی تو ان کے بادشاہ قسطنطین نے بھی عیسائیت قبول کرنے کا اعلان کردیا۔ اس کے بعد عیسائی علماء اور ان کے قائد پوپ کو حکومتی معاملات میں غیر معمولی اثر ورسوخ حاصل ہوگیا۔ حکومتی طاقت کو استعمال کر کے انہوں نے معاشرے میں پھیلے ہوئے شرک اور بت پرستی کا خاتمہ کر دیا اور اس کے ماننے والوں کو عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ جن لوگوں نے عیسائیت قبول کرنے سے انکار کیا انہیں تہہ تیغ کر دیا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ خود عیسائیت میں بھی حلول اور مسیح علیہ الصلوۃ والسلام کو خدا کا بیٹا ماننے کا عقیدہ پیدا ہو گیا اور شخصیت پرستی اور اکابر پرستی نے جنم لیا۔

عیسائی علماء نے وقت کے مسلمہ نظریات جن میں ارسطو اور افلاطون کے سائنسی اور فلسفیانہ افکار بھی شامل تھے کی مقبولیت کے پیش نظر انہیں اپنے دین میں داخل کر لیا۔ حکومتیں پوپ اور مذہبی رہنماؤں کی رہنمائی میں چلنے لگیں جسے آج تھیوکریسی کہا جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ مذہبی رہنما اپنے مسلک اور عقیدے میں شدت اختیار کرتے گئے۔ صدیوں سے

انحطاط (Degeneration) کے عمل سے ان میں بہت سے فرقے بھی پیدا ہو گئے اور ان میں اخلاقی کمزوریاں بھی پیدا ہو گئیں۔ مذہبی انتہا پسندی اس حد تک پہنچ گئی کہ کوئی بھی شخص جو مرکزی چرچ کے معمولی سے حکم سے بھی اختلاف کرتا، اسے مرتد قرار دے کر قتل کر دیا جاتا۔ نئے علوم و فنون کی تحصیل پر پابندی عائد کر دی گئی۔

اسی دور میں مسلمانوں نے یونانی فلسفے کی کتب کا عربی میں ترجمہ کیا اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں قابل قدر اضافے کئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اہل یورپ میں بھی علم حاصل کرنے کا شعور پیدا ہوا اور وہ یہی چیزیں سیکھنے کے لئے مسلم دنیا میں آئے۔ ایک ممتاز امریکی مصنف کے الفاظ میں:

> جیسے جیسے مسلمانوں کا اقتدار پھیلتا گیا، یہ لوگ اچھے سیکھنے والے اور اس پر عمل کرنے والے ثابت ہوئے۔ مسلمان حکمرانوں نے مفتوحہ علاقوں کی ترقی یافتہ تہذیب کے مقابلے میں اپنی کمزوری کو محسوس کرتے ہوئے مقامی اداروں، خیالات، نظریات اور ثقافت کو اسلامی سانچے میں ڈھال لیا۔ انہوں نے اپنے زیادہ ترقی یافتہ مفتوحین سے سیکھنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کی۔ عظیم لائبریریاں اور دار التراجم قائم ہوئے۔ سائنس، طب اور فلسفہ کی بڑی بڑی کتابوں کو مشرق و مغرب سے اکٹھا کر کے ان کے ترجمے کئے گئے۔ یونانی، لاطینی، فارسی، شامی اور سنسکرت زبانوں سے ترجمہ کرنے کا کام عام طور پر یہودی اور عیسائی مفتوحین نے سر انجام دیا۔ اس طرح ادب، سائنس اور طب کی دنیا بھر کی بہترین کتابیں عوام الناس کے لئے میسر ہو گئیں۔ ترجمے کے دور کے بعد تخلیقی کام کا دور شروع ہوا۔ تعلیم یافتہ مسلمان مفکرین اور سائنس دانوں نے حاصل شدہ علم میں قابل قدر علمی اضافے کئے۔ یہ وہ دور تھا جس میں سائنس اور فلسفہ کے عظیم امام ابن سینا، ابن رشد اور

الفارابی پیدا ہوئے۔ بڑے بڑے شہروں قرطبہ، نیشاپور، قاہرہ، بغداد، دمشق اور بخارا میں بڑی بڑی لائبریریاں قائم ہوئیں جبکہ یورپ اس وقت دور تاریک سے گزر رہا تھا۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی سیاسی اور ثقافتی زندگیوں کو، ان کے قبائلی اور مذہبی پس منظر کی رعایت سے اسلام کے فریم ورک میں لایا گیا۔ نئے نظریات اور طور طریقوں کو اسلامائز کیا گیا۔ اسلامی تہذیب ایک متحرک اور تبدیلی کے تخلیقی عمل کا نتیجہ تھی جس میں مسلمانوں نے دوسری تہذیبوں سے آزادانہ اچھی چیزوں کو لیا۔ یہ خود اعتمادی اور کھلے پن کا مظہر تھا جو اس خیال سے پیدا ہوا کہ ہم آقا ہیں غلام نہیں ہیں، فاتح ہیں مفتوح نہیں ہیں۔ بیسویں صدی کے مسلمانوں کے برعکس، وہ مسلمان تحفظ اور اعتماد کے احساسات سے بھرپور تھے۔ ان کو مغرب سے کچھ لینے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہ ہوتی تھی کیونکہ مغرب اس وقت ان پر سیاسی یا ثقافتی غلبہ نہ رکھتا تھا۔ کلچر کا یہ بہاؤ اس وقت الٹی سمت میں بہنے لگا، جب یورپ تاریک ادوار سے نکل کر مسلم مراکز میں اپنا کھویا ہوا ورثہ سیکھنے کے لئے آیا جس میں مسلمانوں کی ریاضی، طب اور سائنس کے اضافے بھی شامل تھے۔

(John L. Esposito, The Islamic Threat: Myth or Reality, 2nd Ed. p. 33-34)

ری نی ساں اور ریفارمیشن کی تحریکیں

تیرہویں سے سترہویں صدی تک یورپ میں چرچ کے اقتدار اور تنگ نظری کے خلاف بغاوت کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ اس دور میں یورپ میں ری نی ساں (Renaissance) اور ری فارمیشن (Reformation) کی تحریکیں چلیں جن میں چرچ پر بھرپور تنقید کی گئی۔

اسی دوران مارٹن لوتھر کی مشہور پروٹسٹنٹ تحریک بھی چلی جس نے دنیائے عیسائیت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یورپ میں ایسے مفکرین بھی پیدا ہونے لگے جن کی تحقیقات نے ارسطو اور افلاطون کے ان سائنسی نظریات کو بھی چیلنج کر دیا جنہیں اہل کلیسا نے طویل عرصے سے مذہبی عقائد کا حصہ بنایا ہوا تھا۔ ان میں سب سے مشہور زمین کے کائنات کا مرکز ہونے اور اس کے ساکن ہونے اور سورج اور تمام اجرام فلکی کے زمین کے گرد گھومنے کا نظریہ تھا۔ ان مفکرین میں لیونارڈو ڈاونسی (1519-1452)، جیارڈینو برونو (1548-1600)، گلیلیو (1642-1564) اور جوہانس کیپلر (1630-1571) زیادہ مشہور ہیں۔

مذہبی علماء نے اس تنقید اور جدید نظریات کا سختی سے نوٹس لیا۔ انہوں نے عقل و منطق اور مشاہدے کی بنیاد پر حاصل ہونے والے سائنسی علم کو طاقت سے دبانا چاہا۔ احتساب (Inquisition) کی مشہور عدالتیں قائم ہوئیں جو اس قسم کے نظریات رکھنے والے مفکرین کو سخت سزائیں دیا کرتے۔ برونو کو کئی سال قید میں رکھنے کے بعد آگ میں زندہ جلا دیا گیا۔ گلیلیو کو اپنے عقائد سے توبہ کرنا پڑی ورنہ اسے بھی موت کی سزا سنادی گئی تھی۔

ری نی ساں کا دور فکر انسانی میں ہر اعتبار سے ترقی کا دور ہے۔ اس دور میں آزادانہ سوچ اور الحاد کو فروغ حاصل ہوا۔ صرف اور صرف چرچ کے حکم کی بنیاد پر کسی چیز کو قبول کرنے کی پابندی کے بڑے مخالفین میں لیونارڈو ڈاونسی تھے۔ انہوں نے علم کے حصول کے لئے تجربے کی اہمیت پر زور دیا۔ نکولو میکیاولی بھی چرچ پر مسلسل تنقید کرتے رہے۔ ان کی شہرت بھی ایک ملحد کی ہے۔ جیارڈینو برونو کی موت (1600) آزادی فکر کے نئے دور کا آغاز ہے۔ برونو اٹلی کے رہنے والے ایک مصنف تھے جو علم کلام کے ماہر تھے۔ اپنی تحریروں کے باعث انہیں محکمہ احتساب (Inquisition) کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا

پڑا۔ انہوں نے پورے یورپ کا سفر کیا جس کے دوران وہ اپنے نظریات کو تقریر و تحریر کے ذریعے پھیلاتے رہے۔ انہیں گرفتار ہو جانے کا خطرہ بھی لاحق رہا۔ چودہ سال کے بعد، وینس شہر میں انہیں ان کے ایک پرانے شاگرد نے احتساب والوں کے ہاتھوں گرفتار کروا دیا۔ برونو احتساب کی عدالت کے سامنے اپنے نظریات سے انحراف نہ کر سکے جن میں مسیح (علیہ الصلوۃ والسلام) کی الوہیت سے انکار، اس دنیا کے ہمیشہ باقی رہنے کا عقیدہ اور روح کے حلول کا عقیدہ شامل ہے۔ وہ نظام شمسی کے کوپر نیکی نظریے (یعنی سورج نظام شمسی کا مرکز ہے) پر بھی یقین رکھتے تھے اور اس پر لیکچر بھی دیا کرتے تھے۔ برونو پر مقدمہ چلایا گیا اور عدالت کے سامنے ان کا جرم ثابت ہو گیا۔ برونو نے روم میں سات سال جیل میں گزارے۔ بالآخر فروری 1600 انہیں آگ میں زندہ جلا دیا گیا۔ اگلے دو سو سال میں ان کے علاوہ آزادی فکر کے اور بھی شہید موجود ہیں۔

(Dr. Gordon Stein, The History of Free Thought and Atheism, www.positiveatheism.org)

مذہبی علماء اور سائنس دانوں میں یہ چپقلش چلتی رہی۔ وقت کے ساتھ ساتھ معاشرے پر اہل کلیسا کی گرفت کمزور ہوتی گئی اور فلسفیوں کا اثر ورسوخ بڑھتا چلا گیا۔ انیسویں صدی کے وسط تک ملحد فلسفیوں اور سائنس دانوں کی فکر اہل یورپ میں غالب فکر بن چکی تھی۔ چونکہ اہل کلیسا نے اپنے اقتدار کے دور میں سائنس دانوں کے ساتھ بہت ظالمانہ اور جابرانہ رویہ رکھا تھا اس لئے مذہب اور سائنس میں ایک وسیع خلیج پیدا ہو چکی تھی۔ اہل سائنس نے مذہب کے بارے میں کوئی معقول رویہ اختیار کرنے کی بجائے اپنے سائنسی نظریات کی روشنی میں یہی مناسب سمجھا کہ اسے خیر باد ہی کہہ دیا جائے۔ اس معاملے میں اہل مذہب کا کردار بھی اتنا معیاری نہ تھا کہ اس کی پیروی کی جاتی۔ چنانچہ مشہور برطانوی ملحد فلسفی برٹرینڈ رسل لکھتے ہیں:

میں تو یہاں تک سوچا کرتا ہوں کہ بعض ہی اہم نیکیاں مذہب کے علمبرداروں میں نہیں ملتیں۔ وہ ان لوگوں میں پائی جاتی ہیں جو مذہب کے باغی ہوتے ہیں۔ ان میں سے دو نیکیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور وہ راست بازی اور ذہنی دیانت ہیں۔ ذہنی دیانت سے میری مراد پیچیدہ مسائل کو ثبوت اور شہادتوں کی بنیاد پر حل کرنے کی عادت ہے۔ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ جب تک کافی ثبوت اور شہادتیں دستیاب نہ ہوں، تب تک ان مسائل کو غیر حل شدہ ہی رہنے دیا جائے۔ ------ - تحقیق کی حوصلہ شکنی ان میں سب سے پہلی خرابی ہے۔ لیکن دوسری خرابیاں بھی پیچھے نہیں رہتیں۔ قدامت پسندوں کو قوت و اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ تاریخی دستاویزات میں اگر کوئی بات عقیدوں کے بارے میں شبہات پیدا کرنے والی ہو تو ان کی تکذیب شروع کر دی جاتی ہے۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ جلد یا بدیر منحرف عقیدے رکھنے والوں کے خلاف مہم شروع کر دی جاتی ہے۔ پھانسیاں گاڑ دی جاتی ہیں اور نظر بندی کے کیمپ بنا دیے جاتے ہیں۔ میں اس شخص کی قدر کر سکتا ہوں جو یہ کہے کہ مذہب سچا ہے لہٰذا ہم کو اس پر ایمان رکھنا چاہئے (اور سچائی ثابت کرے) لیکن ان لوگوں کے لیے میرے دل میں گہری نفرت کے سوا کچھ نہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مذہب کی سچائی کا مسئلہ اٹھانا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے اور یہ کہ ہم کو مذہب اس لئے قبول کر لینا چاہئے کہ وہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ یہ نقطہ نظر سچائی کی توہین کرتا ہے، اس کی اہمیت کو ختم کر دیتا ہے اور جھوٹ کی بالادستی قائم کر دیتا ہے۔ ------ اشتراکیت کی برائیاں وہی ہیں جو ایمان کے زمانوں میں مسیحیت میں پائی جاتی تھیں۔ سوویت خفیہ پولیس کے کارنامے رومن کیتھولک کلیسا کی قرون وسطیٰ کی عدالت احتساب کے کارناموں سے صرف مقداری طور پر ہی مختلف تھے۔ جہاں تک ظلم و ستم کا تعلق ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس

پولیس نے روسیوں کی ذہنی اور اخلاقی زندگی کو ایسا ہی نقصان پہنچایا جیسا کہ مذہبی احتساب کی عدالت نے مسیحی اقوام کی ذہنی اور اخلاقی زندگی کو پہنچایا تھا۔ اشتراکی تاریخ کی تکذیب کرتے ہیں۔ نشاۃ ثانیہ تک چرچ بھی یہی کام کیا کرتا تھا۔ ----- -جب دو سائنس دانوں کے درمیان اختلاف ہوتا ہے تو وہ اختلاف کو دور کرنے کے لئے ثبوت تلاش کرتے ہیں۔ جس کے حق میں ٹھوس اور واضح ثبوت مل جاتے ہیں، وہ راست قرار پاتا ہے۔ ایسا اس لئے ہے کہ سائنس دان ہونے کے حیثیت سے ان دونوں میں سے کوئی بھی خود کو بے خطا خیال نہیں کرتا۔ دونوں سمجھتے ہیں کہ وہ غلطی پر ہو سکتے ہیں۔ اس کے بر خلاف جب دو مذہبی علماء میں اختلاف پیدا ہوتا ہے تو وہ دونوں اپنے آپ کو مبرا عن الخطا خیال کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان سے کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔ دونوں میں سے ہر ایک کو یقین ہوتا ہے کہ صرف وہی راستی پر ہے۔ لہٰذا ان کے درمیان فیصلہ نہیں ہو پاتا۔ بس یہ ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگتے ہیں کیونکہ دونوں کو یقین ہوتا ہے کہ دوسرا نہ صرف غلطی پر ہے، بلکہ راہ حق سے ہٹ جانے کے باعث گناہ گار بھی ہے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ جذبات بھڑک اٹھتے ہیں اور نظری مسائل حل کرنے کے لئے دنگا فساد تک نوبت جا پہنچتی ہے۔ (برٹرینڈ رسل: لوگوں کو سوچنے دو، اردو ترجمہ قاضی جاوید، ص 81-86)

ڈی ازم کی تحریک

اسی دوران Deism کی تحریک بھی پیدا ہوئی۔ اس کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ اگرچہ خدا ہی نے اس کائنات کو تخلیق کیا ہے لیکن اس کے بعد وہ اس سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ اب یہ کائنات خود بخود ہی چل رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس تحریک کا ہدف مذہب کے عقیدہ

سالت و آخرت کا انکار تھا۔ اس تحریک کو فروغ ڈیوڈ ہیوم اور مڈلٹن کے علاوہ مشہور ماہر معاشیات ایڈم سمتھ کی تحریروں سے بھی ملا۔ ان لوگوں نے بھی چرچ پر اپنی تنقید جاری رکھی ور چرچ کا جبر و تشدد جاری رہا۔ تقریباً دو سو سال تک یہ تحریک بھی موجود رہی۔ کلیسا کے انتہا رجے کے جبر و تشدد کا نتیجہ یہ نکلا کہ اٹھارہویں صدی میں یورپ کے اہل علم میں بالعموم نکار خدا کی لہر چل نکلی جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل تک اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ ترکی کے مشہور عالم ہارون یحییٰ کے الفاظ میں:

> یقیناً الحاد یعنی وجود خدا سے انکار کا نظریہ پرانے وقتوں میں بھی موجود رہا ہے لیکن اٹھارہویں صدی میں کچھ اینٹی مذہب مفکرین کے فلسفے کے پھیلاؤ اور سیاسی اثرات سے اس کا عروج شروع ہوا۔ مادیت پرستوں جیسے ڈائڈرٹ اور بیرن ڈی ہالبیک نے یہ نظریہ پیش کیا کہ یہ کائنات مادے کا ایسا مجموعہ ہے جو ہمیشہ سے ایسے ہی موجود ہے اور اس کا کوئی نقطہ آغاز نہیں۔ انیسویں صدی میں الحاد مزید پھیلا۔ بڑے بڑے ملحد مفکرین جیسے مارکس، اینجلز، نٹشے، ڈرخم اور فرائڈ نے سائنس اور فلسفے کی مختلف شاخوں کے علم کو الحادی بنیادوں پر منظم کیا۔ (ان میں سے مارکس اور اینجلز ماہر معاشیات (Economics)، نٹشے ماہر فلسفہ(Philosophy) ، ڈرخم ماہر عمرانیات(Sociology) اور فرائڈ ماہر نفسیات(Psychology) تھے۔) الحاد کو سب سے زیادہ مدد (ماہر حیاتیات) چارلس ڈارون سے ملی جس نے تخلیق کائنات کے نظریے کو رد کر کے اس کے برعکس ارتقاء(Evolution) کا نظریہ پیش کیا۔ ڈارون نے اس سائنسی سوال کا جواب دے دیا تھا جس نے صدیوں سے ملحدین کو پریشان کر رکھا تھا۔ وہ سوال یہ تھا کہ "انسان اور جاندار اشیا کس طرح وجود میں آتی ہیں؟" اس نظریے کے نتیجے میں بہت سے لوگ اس بات کے قائل

ہو گئے کہ فطرت میں ایسا آٹو میٹک نظام موجود ہے جس کے نتیجے میں بے جان مادہ حرکت پذیر ہو کر اربوں کی تعداد میں موجود جاندار اشیا کی صورت اختیار کر تا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک ملحدین کائنات کے بارے میں ایک ایسا نقطہ نظر (Worldview) بنا چکے تھے جو ان کے نزدیک اس کائنات سے متعلق ہر ایک سوال کا جواب دیتا تھا۔ انہوں نے کائنات کی تخلیق کا انکار کرتے ہوئے کہا کہ یہ کائنات ہمیشہ سے ایسے ہی موجود ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ اس کائنات کا کوئی مقصد نہیں۔ اس میں جو توازن پایا جاتا ہے وہ محض ایک اتفاقی امر ہے۔ انہیں یہ یقین ہو گیا کہ جاندار اشیا کے وجود پذیر ہونے کا سوال ڈارون نے حل کر دیا ہے۔ ان کے خیال میں تاریخ اور عمرانیات سے متعلق ہر مسئلے کی تشریح مارکس اور ڈرخم نے کر دی ہے اور ملحدانہ بنیادوں پر فرائڈ نے ہر نفسیاتی سوال کا جواب دے دیا ہے۔

(Harun Yahya, The Fall of Atheism, www.harunyayha.org)

سیکولرازم کا فروغ

اسی الحاد کی بنیاد پر سیکولرازم کا نظریہ وجود پذیر ہوا جو مذہب اور الحاد کے درمیان تطبیق (Reconciliation) کی حیثیت رکھتا تھا۔ فلسفیانہ اور ملحدانہ نظریات نے اہل یورپ کی اشرافیہ کو بری طرح متاثر کر دیا تھا۔ ان کے ہاں تعلیم یافتہ ہونے کا مطلب ہی ملحد اور لادین ہونا تھا۔ دوسری طرف عوام الناس میں اہل مذہب کا اثر ورسوخ خاصی حد تک باقی تھا۔ اہل مذہب کا ایک اور مسئلہ یہ بھی تھا کہ وہ بہت سے فرقوں میں منقسم تھے اور ایک فرقے کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ دوسرے کی بالادستی قبول کر سکے۔ ان حالات میں انہوں

نے یہ طے کر لیا کہ ہر فرد کو اپنی ذات میں تو اپنے عقیدے پر قائم رہنے کی آزادی دی جائے لیکن اجتماعی اور ریاستی سطح پر مذہب سے بالکل لاتعلق ہو کر خالص عقل و دانش اور جمہوریت کی بنیادوں پر نظام حیات کو مرتب کر لیا جائے۔ اگر حکومت کا کوئی سرکاری مذہب ہو بھی تو اس کی حیثیت محض نمائشی ہو، اسے معاملات زندگی سے کوئی سروکار نہ ہو۔

سیکولرازم کے اس نظریے کا فروغ دراصل مذہب کی بہت بڑی شکست اور الحاد کی بہت بڑی فتح تھی۔ اہل مغرب نے اپنے سیاسی، عمرانی اور معاشی نظاموں کو مذہب کی روشنی سے دور ہو کر خالصتاً ملحدانہ بنیادوں پر استوار کیا۔ مذہب کو چرچ تک محدود کر دیا گیا۔ تمام قوانین جمہوری بنیادوں پر بنائے جانے لگے۔ عیسائیت میں بھی فری سیکس گناہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن جمہوری اصولوں کے مطابق اکثریت کی خواہش پر اسے جائز قرار دیا گیا، حتیٰ کہ ہم جنس پرستی کو بھی قانونی مقام دیا گیا اور ایک ہی جنس میں شادی کو بھی قانونی ٹھہرا لیا گیا۔ سود ہمیشہ سے آسمانی مذاہب میں ممنوع رہا ہے، لیکن معیشت کا پورا نظام سود پر قائم کیا گیا۔

سیکولر ازم کے نتیجے میں الحاد اہل مغرب کے نظام حیات میں غالب قوت بن گیا۔ ان کی اکثریت اگرچہ اب بھی خدا کی منکر نہیں ہے لیکن عملی اعتبار سے وہ خدا، نبوت و رسالت اور آخرت کا انکار کر چکی ہے۔ اگر کوئی مذہب کو حق مانتا ہے تو پھر یہ لازم ہے کہ وہ اسے اپنی پرائیویٹ لائف کے ساتھ ساتھ پبلک لائف میں بھی اپنائے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو خدا کو ماننے کے باوجود وہ عملاً خدا، نبوت اور آخرت کا انکار کر کے الحاد کو اختیار کر ہی چکا ہے۔ اب اس کے بعد صرف انسانی اخلاقیات یا دین فطرت ہی باقی رہ جاتا ہے جسے ملحدین بھی مانتے ہیں۔ اہل مغرب اگرچہ ان میں سے بہت سے اصولوں کو چھوڑ چکے ہیں لیکن اب بھی وہ ان اخلاقی اصولوں کے بڑے حصے کو اپنائے ہوئے ہیں۔

باب: 3

مسلم معاشروں میں الحاد کا فروغ

پندرہویں اور سولہویں صدی میں اہل یورپ اپنے ممالک سے نکل کر مشرق و مغرب میں پھیلنا شروع ہوئے۔ انیسویں صدی کے آخر تک وہ دنیا کے بڑے حصے پر اپنی حکومت قائم کر چکے تھے۔ ان کی نو آبادیات میں مسلم ممالک کی اکثریت بھی شامل تھی۔ اہل یورپ نے ان ممالک پر صرف اپنا سیاسی اقتدار ہی قائم نہیں کیا بلکہ ان میں اپنے الحادی نظریات کو بھی فروغ دیا۔ مغربی ملحدین نے عیسائیت کی طرح اسلام کی اساسات پر بھی حملہ کیا۔ مسلم ممالک میں ان کے نظریات کے خلاف چار طرح کے رد عمل سامنے آئے:

- مغربی الحاد کی پیروی
- مغرب کو مکمل طور پر رد کر دینا
- مغرب کی پیروی میں اسلام میں تبدیلیاں کرنا
- مغرب کے مثبت پہلو کو لے کر اسے اسلامی سانچے میں ڈھالنا

مسلم اشرافیہ

پہلا رد عمل مسلمانوں کی اشرافیہ (Elite) کا تھا۔ ان کی اکثریت نے اہل مغرب اور ان کے الحاد کو کلی یا جزوی طور پر قبول کر لیا۔ اگرچہ اپنے نام اور بنیادی عقائد کی حد تک وہ مسلمان ہی تھے لیکن اپنی اجتماعی زندگی میں وہ الحاد اور لادینیت کا نمونہ تھے۔ بیسویں صدی کے وسط میں آزادی کے بعد بھی ان کی یہ روش برقرار رہی۔ ان میں سے بعض تو

اسلام کی تعلیمات کے کھلم کھلا مخالف تھے جن میں ترکی کے مصطفےٰ کمال پاشا، ایران کے رضا شاہ پہلوی، تیونس کے حبیب بورغبیہ اور پاکستان کے جنرل یحییٰ خان شامل ہیں۔ مسلم حکمرانوں کی اکثریت نے اگرچہ اسلام کا کھلم کھلا انکار نہیں کیا لیکن وہ عملی طور پر الحاد ہی سے وابستہ رہے۔ چونکہ مسلم عوام کی اکثریت کا سیاسی و معاشی مفاد انہی کی پیروی میں تھا، اس لئے عوام الناس میں الحاد پھیلتا چلا گیا۔ اس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے۔

روایتی مسلم علماء

دوسرا ردعمل روایتی مسلم علماء کا تھا۔ انہوں نے اہل مغرب کے نظریات کو یکسر مسترد کر دیا۔ انہوں نے مغربی زبانوں کی تعلیم، مغربی علوم کے حصول، مغربی لباس کے پہننے اور اہل مغرب کے ساتھ کسی بھی قسم کے تعلق کو حرام قرار دیا۔ انہوں نے اپنے مدارس کے ماحول کو قرون وسطیٰ کے ماحول میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ انہوں نے دور جدید میں کسی مسئلے پر اجتہادی انداز میں سوچنے کی بجائے قدیم ائمہ کی حرف بہ حرف تقلید پر زور دیا۔ برصغیر میں اس نقطہ نظر کو ماننے والے بڑے بڑے علماء میں قاسم نانوتوی، محمود الحسن، سید نذیر حسین دہلوی اور احمد رضا خان بریلوی شامل تھے جن کے نقطہ نظر کو پورے ہندوستان کے دینی مدارس نے قبول کیا۔

اگرچہ ان علماء میں کچھ مسلکی اور فقہی اختلافات موجود تھے لیکن مغرب کے بارے میں ان کا نقطہ نظر بالکل یکساں تھا۔ اگرچہ ان میں سے بعض مغربی زبانیں سیکھنے اور مغربی علوم کے حصول کے مخالف نہ تھے لیکن عملاً ان کا رویہ اس سے دوری ہی کا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرے میں ان کا اثر و نفوذ کم سے کم تر ہوتا چلا گیا اور ان کے نقطہ نظر کو ماضی کی چیز سمجھ لیا

گیا۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ ان سے بیزار ہونے لگا اور آہستہ آہستہ یا تو پہلے نقطہ نظر کو قبول کر کے الحاد کی طرف چلا گیا یا پھر اس نے تیسرے اور چوتھے نقطہ نظر کو قبول کیا۔

معاشرے میں اب ان اہل علم کا کردار یہی رہ گیا کہ وہ مسجد میں نماز پڑھا دیں، کسی کے گھر میں ختم قرآن کر دیں یا پھر نکاح، بچے کی پیدائش اور جنازے کے وقت چند رسومات ادا کر دیں۔ عملی زندگی میں ان کے کردار کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جمعہ کی نماز کے وقت لوگ اپنے گھروں میں بیٹھ یہ انتظار کر رہے ہوتے ہیں کہ کب مولوی صاحب وعظ ختم کریں اور وہ مسجد میں جا کر نماز جمعہ ادا کریں۔ جیسے ہی وعظ ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے، لوگ جوق در جوق مسجد کی طرف آنے لگتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے لوگوں کو ان کے وعظ اور تقاریر سے کوئی دلچسپی نہیں۔ انہی روایتی علماء میں سے بعض نے جدید دنیا کے علوم سے واقفیت حاصل کر کے عصر حاضر کے زندہ مسائل کو اپنا ہدف بنایا ہے۔ عام روایتی علماء کی نسبت ان کا اثر و نفوذ معاشرے میں بہت زیادہ ہے اور ان کی دعوت کو سننے والے افراد کی کوئی کمی نہیں۔

متجددین

اس دور میں امت مسلمہ کی علمی و فکری قیادت برصغیر اور مصر کے اہل علم کے ہاتھ میں آچکی تھی۔ بعض مسلمان مفکرین نے اسلام کو جدید الحادی نظریات سے منطبق (Reconcile) کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے اسلام کے بعض بنیادی عقائد و اعمال کا بھی انکار کر دیا۔ اس نقطہ نظر کو ماننے اور پھیلانے والوں میں ہندوستان کے سر سید احمد خان، اور مصر کے طٰہٰ حسین اور سعد زغلول شامل ہیں۔ اسی فکر کو بیسویں صدی میں غلام احمد پرویز اور ان کے شاگرد ڈاکٹر عبد الودود نے پیش کیا۔ روایتی اور جدید

نقطہ نظر کے حامل علماء کے اثر و رسوخ کے پیش نظر اس فکر کو مسلم معاشروں میں عام مقبولیت حاصل نہ ہو سکی تاہم اس سے اشرافیہ کا ایک اہم حلقہ ضرور متاثر ہوا۔

جدید مصلحین

چوتھا ردعمل ان اہل علم کا تھا جو روایتی علماء کے قدیم علمی ورثے کے ساتھ ساتھ جدید علوم سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے مغرب کے الحادی افکار پر کڑی نکتہ چینی کی اور تیسرے نقطہ نظر کے حامل علماء کے برعکس اسلام کو معذرت خواہانہ انداز کی بجائے باوقار طریقے سے پیش کیا۔ انہوں نے روایتی علماء پر تنقید کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت تو ناقابل تغیر ہے لیکن قرون وسطیٰ کے علماء نے اپنے ادوار کے تقاضوں کے مطابق جو قانون سازی کی تھی، اس کی تشکیل نو (Reconstruction) کی ضرورت ہے۔ روایتی علماء کے برعکس انہوں نے جدید سائنس و ٹیکنالوجی کے حصول پر زور دیا۔

اس نقطہ نظر کے حاملین میں ہندوستان کے اہل علم میں سے محمد اقبال، ابوالکلام آزاد، شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، حمید الدین فراہی اور سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مصر کے علماء میں رشید رضا، حسن البنا اور سید قطب شامل ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے ممالک کے جدید اہل علم نے انہی کی پیروی کی۔ اسی نقطہ نظر کے حاملین نے عالم اسلام میں بڑی بڑی تحریکیں برپا کیں جنہوں نے جدید طبقے کو اسلام سے متعارف کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ روایتی علماء کی نسبت انہیں تعلیم یافتہ طبقے میں کافی زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کے اثرات اپنے اپنے معاشروں پر نہایت گہرے ہیں۔

باب: 4

مغربی اور مسلم معاشروں پر الحاد کے اثرات

الحاد کے اس عروج نے مغربی اور مسلم معاشروں پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہو گا کہ انہوں نے قدیم ورثے کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا اور عیسائیت اور اسلام کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج پیدا کر دیا۔ ہم الحاد کے اثرات کو نظریات، فلسفے، سیاست، معیشت، معاشرت اور اخلاق ہر پہلو میں نمایاں طور پر محسوس کر سکتے ہیں:

عقائد، فلسفہ اور نظریات

سب سے پہلے ہم نظریاتی اور فلسفیانہ پہلو کو لیتے ہیں۔ الحاد نے عیسائیت اور اسلام کے بنیادی عقائد یعنی وجود باری تعالیٰ، رسالت اور آخرت پر حملہ کیا اور اس کے بارے میں شکوک و شبہات پھیلائے۔ خدا کے وجود سے انکار کر دیا گیا، رسولوں کے تاریخی وجود کا بھی انکار کر دیا گیا اور آخرت سے متعلق طرح طرح کے سوالات اٹھائے گئے۔ اس ضمن میں ملحدین کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی کیونکہ یہ تینوں عقائد مابعد الطبیعاتی حقائق سے تعلق رکھتے ہیں جسے اس دنیا کے مشاہداتی اور تجرباتی علم کی روشنی میں نہ تو ثابت کیا جا سکتا ہے اور نہ رد کیا جا سکتا ہے۔

ان ملحدین نے عیسائیت پر ایک اور طرف سے بڑا حملہ کیا اور وہ یہ تھا کہ قرون وسطیٰ کے عیسائی علماء نے اپنے وقت کے کچھ سائنسی اور فلسفیانہ نظریات کو اپنے نظام عقائد (Theology) کا حصہ بنا لیا تھا جیسے زمین کائنات کا مرکز ہے اور سورج اس کے گرد گھومتا ہے۔ جب جدید سائنسی تحقیقات سے یہ نظریات غلط ثابت ہوئے تو بہت سے لوگوں

کا پوری عیسائیت پر اعتماد اٹھ گیا اور انہوں نے فکری طور پر بھی الحاد کو اختیار کر لیا۔ اسلام میں چونکہ اس قسم کے کوئی عقائد نہیں، لہٰذا اسلام اس قسم کے حملوں سے محفوظ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ الحاد کو مغرب میں تو بہت سے ایسے پیروکار مل گئے جو ہر قسم کے مذہب سے بیزاری کا اعلان کر کے خود کو فخریہ طور پر ملحد (Atheist) کہتے ہیں لیکن مسلمانوں میں انہیں ایسے پیروکار بہت کم مل سکے۔ مسلمانوں میں صرف ایسے چند لوگ ہی پیدا ہوئے جو زیادہ تر کمیونسٹ پارٹیوں میں شامل ہوئے۔ اگر ہم کمیونسٹ تحریک سے وابستہ نسلی مسلمانوں کا جائزہ لیں تو ان میں سے بھی بہت کم ایسے ملیں گے جو خود کو کھلم کھلا دہریہ یا ملحد کہلوانے پر تیار ہوں۔

عیسائیت پر ملحدین کا ایک اور بڑا حملہ یہ تھا کہ انہوں نے انبیاء کرام بالخصوص حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وجود سے انکار کر دیا۔ انہوں نے آسمانی صحیفوں بالخصوص بائبل کو قصے کہانیوں کی کتاب قرار دیا۔ اس الزام کا کامیاب دفاع کرتے ہوئے کچھ عیسائی ماہرین آثار قدیمہ نے اپنی زندگیاں وقف کر کے علمی طور پر یہ بات ثابت کر دی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک تاریخی شخصیت ہیں اور بائبل محض قصے کہانیوں کی کتاب ہی نہیں بلکہ اس میں بیان کئے گئے واقعات تاریخی طور پر مسلم ہیں اور ان کا ثبوت آثار قدیمہ کے علم سے بھی ملتا ہے۔ یہ الحاد کے مقابلے میں عیسائیت کی بہت بڑی فتح تھی۔

اسلام کے معاملے میں ملحدین ایسا نہ کر سکے کیونکہ قرآن اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخی حیثیت کو چیلنج کرنا ان کے لئے علمی طور پر ممکن نہ تھا۔ انہوں نے اسلام پر حملہ کرنے کی دوسری راہ نکالی۔ ان میں سے بعض کوتاہ قامت اور علمی بد دیانتی کے شکار افراد نے چند من گھڑت روایات کا سہارا لے کر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی کردار پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں بری طرح ناکام ہوئے کیونکہ ان من گھڑت روایات

کی علمی و تاریخی حیثیت کو مسلم علماء نے احسن انداز میں واضح کر دیا جسے انصاف پسند ملحد محققین نے بھی تسلیم کیا۔ ان محققین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی عظمت کو کھلے دل سے اعتراف کیا۔

خدا کی ذات کے متعلق جو شکوک و شبہات ان ملحدین نے پھیلائے تھے، اس کی بنیاد چند سائنسی نظریات پر تھی۔ بیسویں صدی کی سائنسی تحقیقات جو خود ان ملحدین کے ہاتھوں ہوئیں، نے یہ بات واضح کر دی کہ جن سائنسی نظریات پر انہوں نے اپنی عمارت تعمیر کی تھی، بالکل غلط ہیں۔ اس طرح ان کی وہ پوری عمارت اپنی بنیاد ہی سے منہدم ہو گئی جو انہوں نے تعمیر کی تھی۔ اس کی تفصیل ہم آگے بیان کر رہے ہیں۔

سیاست

فکری اور نظریاتی میدان میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ الحاد اسلام کے مقابلے میں ناکام رہا مگر عیسائیت کے مقابلے میں اسے جزوی فتح حاصل ہوئی البتہ سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی میدانوں میں الحاد کو مغربی اور مسلم دنیا میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ سیاسی میدان میں الحاد کی سب سے بڑی کامیابی سیکولر ازم کا فروغ ہے۔ پوری مغربی دنیا اور مسلم دنیا کے بڑے حصے نے سیکولر ازم کو اختیار کر لیا۔ سیکولر ازم کا مطلب ہی یہ ہے کہ مذہب کو گرجے یا مسجد تک محدود کر دیا جائے اور کاروبار زندگی کو خالصتاً انسانی عقل کی بنیاد پر چلایا جائے جس میں مذہبی تعلیمات کا کوئی حصہ نہ ہو۔

مغربی دنیا نے تو سیکولر ازم کو پوری طرح قبول کر لیا اور اب اس کی حیثیت ان کے ہاں ایک مسلمہ نظریے کی ہے۔ انہوں نے اپنے مذہب کو گرجے کے اندر محدود کر کے کاروبار حیات کو مکمل طور پر سیکولر کر لیا ہے۔ چونکہ اہل مغرب کے زیر اثر مسلمانوں کی اشرافیہ بھی الحاد کے اثرات کو قبول کر چکی تھی، اس لئے ان میں سے بھی بہت سے ممالک نے سیکولر ازم کو

بطور نظام حکومت کے قبول کر لیا۔ بعض ممالک جیسے ترکی اور تیونس نے تو اسے کھلم کھلا اپنانے کا اعلان کیا لیکن مسلم ممالک کی اکثریت نے سیکولر ازم اور اسلام کا ایک ملغوبہ تیار کرنے کی کوشش کی جس میں بالعموم غالب عنصر سیکولر ازم کا تھا۔

الحاد کو فروغ جمہوریت کے نظریے سے بھی ہوا۔ اگرچہ جمہوریت عملی اعتبار سے اسلام کے مخالف نہیں کیونکہ اسلام میں بھی آزادی رائے اور شوریٰ کی بڑی اہمیت ہے، لیکن جمہوریت جن نظریاتی بنیادوں پر قائم ہے وہ خالصتاً ملحدانہ ہے۔ جمہوریت کی بنیاد حاکمیت جمہور کے نظریے پر قائم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر عوام کی اکثریت خدا کی مرضی کے خلاف فیصلہ دے دے تو ملک کا قانون بنا کر اس فیصلے کو نافذ کر دیا جائے۔ اس کی واضح مثال ہمیں اہل مغرب کے ہاں ملتی ہے جہاں اپنے دین کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے ہوئے انہوں نے فری سیکس، ہم جنس پرستی، شراب اور سود کو حلال کر لیا ہے۔ مسلمانوں کے ہاں اس کی مثال شاید ترکی ہی میں مل سکتی ہے۔

اسلام نظریاتی طور پر جمہوریت کے اقتدار اعلیٰ کے نظریے کا شدید مخالف ہے۔ اسلام کے مطابق حاکمیت اعلیٰ جمہور کا حق نہیں بلکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اسلام کی نظر میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کرنا شرک ہے۔ سب سے بڑا اقتدار (Sovereignty) صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اس کے برعکس جہاں اللہ تعالیٰ نے کوئی ہدایت نہیں دی، وہاں عوام کی اکثریتی رائے اور مشورے سے فیصلہ کیا جانا چاہئے۔ اکثریت کی مرضی کے خلاف اس پر اقلیتی رائے کو مسلط کرنا اسلام میں درست نہیں۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ ہر معاملہ مشورے سے طے کریں۔

معیشت

معیشت کے باب میں الحاد نے دنیا کو دو نظام دیے۔ ان میں سے ایک ایڈم سمتھ کا

سرمایہ دارانہ نظام یا کیپیٹل ازم اور دوسرا کارل مارکس کی اشتراکیت یا کیمونزم۔ کیپیٹل ازم دراصل جاگیر دارانہ نظام (Feudalism) ہی کی ایک نئی شکل ہے جو عملی اعتبار سے جاگیر دارانہ نظام سے تھوڑا سا بہتر ہے۔ کیپیٹل ازم میں مارکیٹ کو مکمل طور پر آزاد چھوڑا جاتا ہے جس میں ہر شخص کو یہ آزادی ہوتی ہے کہ وہ دولت کے جتنے چاہے انبار لگا لے۔ جس شخص کو دولت کمانے کے لامحدود مواقع میسر ہوں وہ امیر سے امیر تر ہوتا جائے گا اور جسے یہ مواقع میسر نہ ہوں وہ غریب سے غریب تر ہوتا چلا جائے گا۔ حکومت اس سلسلے میں کوئی مداخلت نہیں کرتی۔

جاگیر دارانہ نظام کی طرح اس نظام میں بھی سرمایہ دار، غریب کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اس کا استحصال کرتا ہے۔ غریب اور امیر کی خلیج اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ ایک طرف تو گھی کے چراغ جلائے جاتے ہیں اور دوسری طرف کھانے کو دال بھی میسر نہیں ہوتی۔ ایک طرف تو ایک شخص ایک وقت کے کھانے پر ہزاروں روپے خرچ کر دیتا ہے اور دوسری طرف ایک شخص کو بھوکا سونا پڑتا ہے۔ ایک طرف تو علاج کے لئے امریکہ یا یورپ جانا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا اور دوسری طرف ڈسپرین خریدنے کی رقم بھی نہیں ہوتی۔ ایک طرف بچوں کو تعلیم کے لئے ترقی یافتہ ممالک کی یونیورسٹیوں کے دروازے کھلے ہوتے ہیں اور دوسری طرف بچوں کو سرکاری سکول میں تعلیم حاصل دلوانے کے لئے بھی ماں باپ کو فاقے کرنا پڑتے ہیں۔ ایک طرف محض ایک لباس سلوانے پر لاکھوں روپے خرچ کئے جاتے ہیں اور دوسری طرف استعمال شدہ کپڑے خریدنے کے لئے بھی پیٹ کاٹنا پڑتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کے اس تفاوت کی مکمل ذمہ داری الحاد پر ہی نہیں ڈالی جاسکتی کیونکہ اس کا پیشرو نظام فیوڈل ازم، جو کہ اس سے بھی زیادہ استحصالی نظام ہے، اس دور میں ارتقاء پذیر ہوا جب مغربی دنیا میں عیسائی علماء اور مسلم دنیا میں مسلم علماء طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔

یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ عیسائی تھیو کریسی اور مسلم علماء نے جاگیر دارانہ نظام کے ظلم ستم اور استحصال کے خلاف کبھی موثر جدوجہد نہیں کی بلکہ اپنے ادیان کی تعلیمات کے عکس وہ اس کے سرپرست بنے رہے۔

اٹھارہویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد فیوڈل ازم کی کوکھ سے کیپیٹل ازم نے جنم لیا جو امیر کے ہاتھوں غریب کے استحصال کا ایک نیا نظام تھا لیکن اس کا استحصالی پہلو فیوڈل ازم کی نسبت کم تھا کیونکہ وہاں تو بہتر مستقبل کی تلاش میں غریب کسی اور جگہ جا بھی نہیں سکتا۔ چونکہ اہل مغرب اور اہل اسلام اپنے دین کی تعلیمات سے خاصے دور ہو چکے تھے، اس لئے یہ نظام اپنے پورے استحصالی رنگ میں پنپتا رہا۔

یورپ میں کارل مارکس نے کیپیٹل ازم کے استحصال کے خلاف ایک عظیم تحریک شروع کی جس میں اس نظام کی معاشی ناہمواریوں پر زبردست تنقید کی گئی۔ مارکس اور ان کے ساتھی فریڈرک اینجلز، جو بہت بڑے ملحد فلسفی تھے، نے پوری تاریخ کی ایک نئی توجیہ (Interpretation) کر ڈالی جس میں انہوں نے معاش ہی کو انسانی زندگی اور انسانی تاریخ کا محور و مرکز قرار دیا۔ ان کے نزدیک تاریخ کی تمام جنگیں، تمام مذاہب اور تمام سیاسی نظام معاشیات ہی کی پیداوار تھے۔ انہوں نے خدا، نبوت اور آخرت کے عقائد کا انکار کرتے ہوئے دنیا کو ایک نیا نظام پیش کیا جسے تاریخ میں کمیونزم کے نام سے یاد رکھا جائے گا۔ کمیونزم کا نظام خالصتاً الحادی نظام تھا۔

کمیونسٹ نظام انفرادی ملکیت کی مکمل نفی کرتا ہے اور تمام ذرائع پیداوار جن میں زراعت، صنعت، کان کنی اور تجارت شامل ہے کو مکمل طور پر حکومت کے کنٹرول میں دے دیتا ہے۔ پوری قوم ہر معاملے میں حکومت کے فیصلوں پر عمل کرتی ہے جو کہ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ کمیونسٹ جدوجہد پوری دنیا میں پھیل گئی۔ اسے سب سے پہلے

کامیابی روس میں ہوئی جہاں لینن کی قیادت میں 1917 میں کمیونسٹ انقلاب برپا ہوا اور دنیا کی پہلی کمیونسٹ حکومت قائم ہوئی۔ دوسرا بڑا ملک، جس نے کمیونزم کو قبول کیا، چین تھا۔ باقی ممالک نے کمیونزم کی تبدیل شدہ صورتوں کو اختیار کیا۔

کمیونزم کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ اس میں فرد کے لئے کوئی محرک (Incentive) نہیں ہوتا جس سے وہ اپنے ادارے کے لئے اپنی خدمات کو اعلیٰ ترین انداز میں پیش کر سکے اور اس کے لئے زیادہ سے زیادہ محنت کر سکے۔ اس کے برعکس کیپیٹل ازم میں ہر شخص اپنے کاروبار کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے اور اس سے زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کے لئے دن رات محنت کرتا ہے اور اپنی اعلیٰ ترین صلاحیتیں استعمال کرتا ہے۔ کمیونزم کی دوسری بڑی خامی یہ تھی کہ پورے نظام کو جبر کی بنیادوں پر قائم کیا گیا اور شخصی آزادی بالکل ہی ختم ہو کر رہ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سوویت یونین کی معیشت کمزور ہوتی گئی اور بالآخر 1990 میں یہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔ اس کے بعد اسے کیپیٹل ازم ہی کو اپنانا پڑا۔ دوسری طرف چین کی معیشت کا حال بھی پتلا تھا۔ چین نے اپنی معیشت کو بہتر بنانے کے لئے کمیونزم کو خیر باد کہہ دیا اور تدریجاً اپنی مارکیٹ کو اوپن کر کے کیپیٹل ازم کو قبول کر لیا۔ چین کی موجودہ ترقی کیپیٹل ازم ہی کی مرہون منت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کیپیٹل ازم اور کمیونزم دونوں نظام ہائے معیشت ہی استحصال پر مبنی نظام ہیں۔ ایک میں امیر غریب کا استحصال کرتا ہے اور دوسرے میں حکومت اپنے عوام کا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اہل مغرب نے اعلیٰ ترین اخلاقی اصولوں کو اپنا کر کیپیٹل ازم کے استحصالی نقصانات کو کافی حد تک کم کر لیا ہے، لیکن تیسری دنیا جس کی اخلاقی حالت بہت کمزور ہے وہاں اس کے نقصانات کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

چونکہ یہاں ہم الحاد کی تاریخ کا مطالعہ کر رہے ہیں اس لئے یہ کہنا مناسب ہو گا کہ پچھلی تین صدیوں میں معیشت کے میدان میں الحاد کو دنیا بھر میں واضح برتری حاصل رہی ہے اور دنیا نے الحاد پر قائم دو نظام ہائے معیشت یعنی کیپیٹل ازم اور کیمونزم کا تجربہ کیا ہے۔ کیمونزم تو اپنی عمر پوری کر کے تاریخ کا حصہ بن چکا ہے، اس لئے اس پر ہم زیادہ بحث نہیں کرتے لیکن کیپیٹل ازم کے چند اور پہلوؤں کا ایک مختصر جائزہ لینا ضروری ہے جو انسانیت کے لئے ایک خطرہ ہیں۔

کیپیٹل ازم کے نظام کی بنیاد سود پر ہے۔ بڑی بڑی صنعتوں کے قیام اور بڑے بڑے پراجیکٹس کی تکمیل کے لئے وسیع پیمانے پر فنڈز کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک سرمایہ دار کے لئے اتنی بڑی رقم کا حصول بہت مشکل ہوتا ہے۔ اگر اس کے پاس اتنی رقم موجود بھی ہو تو اسے ایک ہی کاروبار میں لگانے سے کاروباری خطرہ (Business Risk) بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ ایک کاروبار اگر ناکام ہو جائے تو پوری کی پوری رقم ڈوبنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اگر وہی رقم تھوڑی تھوڑی کر کے مختلف منصوبوں میں لگائی جائے تو ایک منصوبے کی ناکامی سے پوری رقم ڈوبنے کا خطرہ نہیں ہوتا اور تمام کے تمام منصوبوں کے ڈوبنے کا خطرہ بھی نہیں ہوتا۔ اسے علم مالیات (Finance) کی اصطلاح میں Diversification کہا جاتا ہے۔

ان بڑے بڑے پراجیکٹس کے لئے رقم کی فراہمی کے لئے دنیا نے Financial Intermediaries کا نظام وضع کیا ہے۔ اس درمیانی واسطے کا سب سے بڑا حصہ بینکوں پر مشتمل ہے۔ یہ بینک عوام الناس کی چھوٹی چھوٹی بچت کی رقوم کو اکٹھا کرنے کا کام کرتے ہیں جس پر بینک انہیں سود ادا کرتا ہے۔ پوری ملک کے لوگوں کی تھوڑی تھوڑی بچتوں کو ملا کر بہت بڑی تعداد میں فنڈ اکٹھا کر لیا جاتا ہے جو انہی سرمایہ داروں کو کچھ زیادہ شرح سود پر دیا

جاتا ہے۔ مثلاً اگر بینک عوام کو 8% سود کی ادائیگی کر رہا ہے تو سرمایہ دار سے 10% سود وصول کر رہا ہو گا۔ اس 2% میں بینک اپنے انتظامی اخراجات پورے کر کے بہت بڑا منافع بھی کما رہا ہوتا ہے۔

سرمایہ دار عموماً اپنے سرمایے کو ایسے کاروبار میں لگاتے ہیں جو اس سرمایے پر بہت زیادہ منافع دے سکے۔ اگر ہم دنیا بھر کی مختلف کمپنیوں کی سالانہ رپورٹس (Annual Reports) کا جائزہ لیں تو ہمیں اس میں ایسے کاروبار بھی ملیں گے جن میں Return on Capital Employed کی شرح 50% سالانہ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوگی۔ اس منافع کا ایک معمولی سا حصہ بطور سود ان غریب لوگوں کے حصے میں بھی آتا ہے جن کا سرمایہ دراصل اس کاروبار میں لگا ہوتا ہے۔

اس کو ایک مثال سے اس طرح سمجھ لیجئے کہ بالفرض ایک سرمایہ دار کسی بینک سے ایک ارب روپے 10% سالانہ شرح سود پر لیتا ہے اور اس سرمائے سے پچاس کروڑ روپے سالانہ نفع کماتا ہے۔ اس میں سے وہ دس کروڑ بینک کو بطور سود ادا کرے گا اور بینک اس میں سے 8% سالانہ کے حساب سے آٹھ کروڑ روپے اپنے کھاتہ داروں (Deposit Holders) کو ادا کرے گا۔ چونکہ یہ کھاتہ دار بہت بڑی تعداد میں ہوں گے جنہوں نے اپنی تھوڑی تھوڑی بچت بینک میں جمع کروائی ہو گی اس لئے ان میں سے ہر ایک کے حصے میں چند ہزار یا چند سو روپے سے زیادہ نہیں آئے گا۔ اس طریقے سے سرمایہ دار، عام لوگوں کو چند ہزار روپے پر ٹرخا کر ان کا پیسہ استعمال کرتا ہے اور اسی پیسے سے خود کروڑوں روپے بنالیتا ہے۔

اس مثال سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جس طرح جاگیر دارانہ نظام میں جاگیر دار یا مہاجن غریبوں کو سود پر رقم دے کر ان کا استحصال کیا کرتا تھا، اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ دار غریبوں سے سود پر رقم لے کر ان کا استحصال کرتا ہے۔ اس کے علاوہ فیوڈل ازم کے مہاجنی

دز کا سلسلہ بھی اس نظام میں پوری طرح جاری ہے جس میں کریڈٹ کارڈز کے ذریعے Micro-Financing کا سلسلہ جاری ہے۔ اس معاملے میں 36% سالانہ کے حساب سے سود بھی وصول کیا جارہا ہے۔ اس سود میں سے صرف 8-10% اپنے کھاتہ داروں کو ادا کیا جارہا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی ایک اور خصوصیت جوئے کا فروغ ہے۔ یہ لعنت فیوڈل ازم میں بھی اسی طرح پائی جاتی تھی۔ دنیا بھر میں جوا کھیلنے کے بڑے بڑے ادارے قائم کئے جاچکے ہیں۔ سٹاک ایکسچینج، فاریکس کمپنیز اور بڑی بڑی کیپیٹل اور منی مارکیٹس ان کیسینوز کے علاوہ ہیں جہاں بڑی بڑی رقوم کا سٹہ کھیلا جاتا ہے۔ کھربوں روپے سٹے میں برباد کر دیے جاتے ہیں مگر بھوک سے مرنے والے بچوں کا کسی کو خیال نہیں آتا۔ ان کیسینوز میں جوئے کے ساتھ ساتھ بے حیائی اور بدکاری کو بھی فروغ مل رہا ہے بلکہ دنیا بھر میں سیاحت کو فروغ دینے کے لئے جوئے اور بدکاری کے مراکز بھی قائم کئے جاچکے ہیں۔ سود اور جوا ایسی برائیاں ہیں جن کا تعلق الحاد کی اخلاقی بنیادوں سے قائم کیا سکتا ہے۔ اس کی مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

اخلاق اور معاشرت

الحاد کے اثرات سے جو چیز سب سے زیادہ متاثر ہوئی ہے، وہ اخلاق انسانی اور نظام معاشرت ہے۔ اگر کوئی یہ مان لے کہ اس دنیا کا کوئی خدا نہیں ہے، موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے جہاں اسے اپنے کئے کا حساب دینا ہوگا تو پھر سوائے حکومتی قوانین یا معاشرتی دباؤ کے کوئی چیز دنیا میں اسے کسی برائی کو اختیار کرنے سے نہیں روک سکتی۔ پھر اس کی زندگی کا مقصد اس دنیا میں زیادہ سے زیادہ دولت اور اس سے لطف اندوز ہونا ہی رہ جاتا ہے۔

اگر کسی کو یقین ہو کہ کوئی اسے نہیں پکڑ سکتا تو پھر کیا حرج ہے کہ اگر وہ اپنے کسی بوڑھے رشتے دار کی دولت کے حصول کے لئے اس کو زہر دے دے؟ اگر وہ اتنا ہوشیار ہو کہ پولیس

اس کا سراغ نہیں لگا سکتی تو پھر لاکھوں روپے کے حصول کے لئے چند بم دھماکے کر کے دہشت گرد بننے میں کیا حرج ہے؟ قانون سے چھپ کر کسی کی عصمت دری سے اگر کسی کی درندگی کی تسکین ہوتی ہے تو اس میں کیا رکاوٹ ہے؟ اپنی خواہش کی تسکین کے لئے بچوں کو اغوا کر کے، ان سے زیادتی کر کے، انہیں قتل کر کے تیزاب میں گلا سڑا دینے میں آخر کیا قباحت ہے؟ اپنے یتیم بھتیجے کا مال ہڑپ کر جانے سے آخر کیا فرق پڑتا ہے؟ جھوٹا کلیم داخل کر کے اگر کسی کو اچھی خاصی جائیداد مل سکتی ہے تو کوئی ایسا کیوں نہ کرے؟ کسی کو اپنی گاڑی کے نیچے کچلنے کے بعد اسے ہسپتال تک پہنچا کر اپنا وقت برباد کرنے کی آخر کیا ضرورت ہے؟ جائیداد کو تقسیم ہونے سے بچانے کے لئے اگر کوئی اپنی بہن یا بیٹی پر کاروکاری کا الزام لگا کر اسے قتل کر دے تو کیا قیامت برپا ہو جائے گی؟ اپنے دشمنوں کی بہو بیٹیوں کو ننگا کر کے بازاروں میں گھمانے پھرانے سے اگر کسی کے انتقامی جذبات سرد پڑتے ہیں تو ایسا کرنے میں کیا حرج ہے؟ اپنی لاگت (Cost) کو کم کرنے کے لئے اگر کوئی خوراک یا ادویات میں ملاوٹ بھی کر دے اور خواہ چند لوگ مر بھی جائیں تو کیا ہے، اس کا منافع تو بڑھ جائے گا؟ ذخیرہ اندوزی کر کے اگر کسی کے مال کی قیمتیں چڑھ سکتی ہیں تو وہ ایسا کیوں نہ کرے؟ اگر تیز رفتاری میں کسی کو مزہ آتا ہے تو کیا فرق پڑتا ہے اگر اس سے کوئی ایک آدھ آدمی مر جائے یا ہمیشہ کے لئے معذور ہو جائے، اتنے مزے کے لئے ایک آدھ بندہ مارنا کونسا مسئلہ ہے؟ اگر کوئی کسی کے نظریات سے اختلاف کرے تو اسے گولی مارنے میں کیا قباحت ہے؟ یا پھر یہ سب نہ بھی ہو تو کوئی اپنا وقت معاشرے کی خدمت میں کیوں لگائے، وہ اپنے وقت کو زیادہ سے زیادہ enjoyment کے حصول میں ہی کیوں نہ خرچ کرے؟ اگر کوئی اپنے جرم کو چھپا سکتا ہو تو پھر سرکاری سودوں میں کمیشن کھا کر ملک و قوم کو نقصان پہنچانے میں کیا چیز مانع ہے؟

یہ وہ مثالیں ہیں جو روزانہ ہمارے سامنے اخبارات میں آتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم

وحشی درندوں کے درمیان اپنی زندگی گزار رہے ہیں جن پر انسان اور مسلمان ہونے کا محض لیبل لگا ہوا ہے۔ کم و بیش اسی قسم کے واقعات تیسری دنیا کے دیگر ممالک میں بھی پیش آتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا کہ مسلم دنیا پر بھی الحاد غالب آ چکا ہے۔ ایسا تو نہیں ہوا کہ مسلمان توحید، رسالت اور آخرت کا کھلم کھلا انکار کر دیں لیکن عملی طور پر ہم ان حقیقتوں سے غافل ہو چکے ہیں۔ خدا ہے یا نہیں ہے، اس نے اپنے کسی رسول کو اس دنیا بھی بھیجا یا نہیں بھیجا، آخرت ہو گی یا نہیں ہو گی، اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ ہمارا ہر عمل پکار پکار کر ہمارے ملحد ہونے کا اعلان دے رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں قانون کی طاقت سے صرف چند بدمعاشوں ہی کو کنٹرول کیا جا سکتا ہے اور وہ بھی تب جب ان کے جرائم منظر عام پر آ جائیں۔ معاشرہ دباؤ ڈال کر صرف ان لوگوں کی اصلاح کر سکتا ہے جن کے جرائم کا انہیں علم ہو جائے اور ان لوگوں کی تعداد معاشرے میں آٹے میں نمک کے برابر ہو۔ جو چیز جرائم کی شرح کو کم سے کم کرتی ہے وہ یہی انسانی اخلاقیات کا شعور ہی تو ہے۔ یہ شعور صرف ایک غالب قوت اور اس کے سامنے جواب دہی کے تصور ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ ایک ملحدانہ معاشرے میں یہ تصور کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے؟

یہ سب سے نمایاں سوال ہے جو الحاد پر کیا گیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ دنیا بھر کے ملحد مفکرین اور فلسفی اس اخلاقی شعور سے بے بہرہ ہوں۔ بلکہ وہ خود کو اخلاق اور انسانی حقوق کے علمبردار کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے اس سوال کا پوری طرح جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک فکر آخرت کا نعم البدل یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے کے ساتھ اس وجہ سے زیادتی نہ کرے کہ جواب میں وہ بھی زیادتی کر سکتا ہے یعنی دوسرے شخص کے منفی رد عمل سے بچنے کے لئے اس سے زیادتی نہ کی جائے۔

اگر اس اخلاقی معیار کو درست مان لیا جائے تو ایسا صرف اور صرف اس صورت میں ممکن ہے جب دونوں فریق قوت و اقتدار کے اعتبار سے بالکل مساوی درجے پر ہوں۔ ایک طاقتور شخص اگر کسی سے زیادتی کرے تو اسے جوابی ردعمل کا کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے؟ اگر غور کیا جائے تو دنیا بھر کے مجرموں اور جرائم پیشہ افراد اسی اخلاقی ضابطے کی پیروی کرتے ہیں۔ چوری اور ڈاکے کے بعد لوٹ کا مال آپس میں بڑی دیانت داری سے تقسیم کر لیا جاتا ہے۔ جوئے میں ہاری ہوئی رقم کو بڑی شرافت سے ادا کر دیا جاتا ہے۔ منشیات فروش اپنا اپنا حصہ بڑی دیانت داری سے ایک دوسرے کو ادا کرتے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے سے دیانت دار یہ جرائم پیشہ لوگ پورے معاشرے کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ میرا ساتھی تو کسی طرح مجھے نقصان پہنچا سکتا ہے لیکن ایک عام آدمی نہیں۔

الحاد کے اخلاقی اثرات بڑے واضح طور پر تیسری دنیا میں تو دیکھے جاسکتے ہیں لیکن دنیا کے ترقی یافتہ حصے میں یہ اثرات اتنے نمایاں نہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ الحاد کی تحریک کو سب سے پہلے فروغ مغرب میں حاصل ہوا لیکن وہاں کے لوگوں کا اخلاقی معیار تیسری دنیا سے نسبتاً بہتر ہے۔

کوئی بھی فلسفہ یا نظام حیات سب سے پہلے معاشرے کے ذہین ترین لوگ تشکیل دیتے ہیں اور پھر اسے اپنی تقریر و تحریر کے ذریعے معاشرے کے ذہین طبقے میں پھیلاتے ہیں جسے عرف عام میں اشرافیہ (Elite) کہتے ہیں۔ یہی طبقہ معاشرے میں تعلیم و ابلاغ کے تمام ذرائع پر قابض ہوتا ہے۔ اس فلسفے یا نظام حیات کو قبول کرنے کے بعد یہ اسے عوام الناس تک پہنچاتا ہے۔ عوام ہر معاملے میں اسی اشرافیہ کے تابع ہوتے ہیں، اسلیئے وہ اسے دل و جان سے قبول کر لیتے ہیں۔ اہل مغرب میں الحادی نظریات کے فروغ میں جن ذہین افراد نے

حصہ لیا وہ اخلاقی اعتبار سے کوئی گرے پڑے لوگ نہ تھے۔ انہوں نے خود کو انسانی اخلاق کے علمبردار کی حیثیت سے پیش کیا۔ جدید دور میں الحاد کی تحریک نے اپنا نام انسانی تحریک (Humanist) رکھ لیا ہے اور وہ خود کو اخلاقیات کا چیمپئن سمجھتے ہیں۔ چنانچہ کونسل فار سیکولر ہیومن ازم کے بانی پال کرٹز اپنی حالیہ تحریر میں لکھتے ہیں۔

میں تیسری طرف جو جنگ لڑنا ہے وہ انسانی اخلاقیات کی جنگ ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اخلاقی انقلاب ہی انسانیت کے مستقبل کی ضمانت دیتا ہے۔ یہی آخرت کی نجات یا جنت کے عقیدے کے بغیر انسانی زندگی کو بہتر بناتا ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم اخلاقی اقدار کو مشاہدے اور دلائل کی بنیاد پر پرکھیں اور نتائج کی روشنی میں اپنی اخلاقی اقدار میں تبدیلی کرنے پر تیار رہیں۔ ہمارا طریقہ عالمی (پلینیٹری) ہے، جیسا کہ Humanist Manifesto 2000 میں زور دیا گیا ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس سیارے زمین پر ہر انسان بالکل برابر حیثیت رکھتا ہے۔ اخلاق کے ساتھ ہماری وابستگی یہ ہے کہ عالمی برادری میں ہر فرد کو اس کے حقوق ملیں اور ہم اپنے مشترکہ گھر یعنی اس زمین کی حفاظت کریں۔ انسانی اخلاقیات فرد کی آزادی، پرائیویسی کے حق، انسانی آزادی اور سماجی انصاف کی ضمانت دیتے ہیں۔ اس کا تعلق پوری نسل انسانیت کی فلاح و بہبود سے ہے۔

(Paul Kurtz, The Secular Humanist Prospect: In Historical Perspective, Free Inquiry Magazine, Vol. 23, No. 4, May 2003)

ان فلسفیوں نے انسانی حقوق اور انسانی اخلاق کو اپنے فلسفے میں بہت اہمیت دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان ممالک کے عوام میں اخلاقی شعور نسبتاً بہت بہتر ہے۔ وہ لوگ بالعموم جھوٹ کم بولتے ہیں، اپنے کاروبار میں بد دیانتی سے اجتناب کرتے ہیں، ایک دوسرے کا استحصال کم

کرتے ہیں، فرد کی آزادی کا احترام کرتے ہیں، جانوروں کے حقوق کا خیال رکھتے ہیں، یتیموں اور اپاہجوں کے لئے ان کے ہاں منظم ادارے ہیں، قانون کا احترام کرتے ہیں، ان کی سوچ عموماً معقولیت (Rationality) پر مبنی ہوتی ہے، وہ عقل و دانش کی بنیاد پر اپنے نظریات کو تبدیل کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں، ان کے ہاں ایک دوسرے کو مذہبی آزادی دی جاتی ہے، ایک دوسرے کا احترام کیا جاتا ہے، محض اختلاف رائے کی بنیاد پر کوئی کسی کو گولی نہیں مارتا، علم و دانش کا دور دورہ ہے، اشیاء خالص ملتی ہیں اور ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھانے والے ادارے بہت موثر ہیں۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ اخلاقی لحاظ سے یہ لوگ فرشتے بن گئے ہیں، بلکہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان لوگوں میں بہت سی اخلاقی خرابیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ یہ لوگ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے، ان کی خدمت نہیں کرتے، جنسی بے راہ روی ان کے ہاں عام ہے، ان کی اکثریت طرح طرح کے نشے میں سکون تلاش کرتی نظر آتی ہے، ان میں تشدد کا رجحان بڑھتا ہوا نظر آتا ہے، اور بالخصوص ان کے اخلاقی معیارات اپنی قوم کے افراد کے لئے کچھ اور ہیں اور باقی دنیا کے لئے کچھ اور۔ نیشنلزم کا جذبہ بہت طاقتور ہونے کی وجہ سے یہ اپنی قوم کے افراد کے لئے تو ابریشم کی طرح نرم ہیں اور ہر اخلاقی اصول کی پیروی کرتے ہیں لیکن جب معاملہ کسی دوسری قوم کے ساتھ ہو تو وہاں انسانی حقوق کے تمام سبق یہ بھول جاتے ہیں۔

جب یہ الحادی نظریات اہل مغرب سے نکل کر مشرقی قوموں میں آئے تو اشرافیہ کے جس طبقے نے انہیں قبول کیا، بدقسمتی سے وہ اخلاقی اعتبار سے نہایت پست تھا۔ جب یہ طبقہ اور اس کے زیر اثر عوام الناس عملی اعتبار سے الحاد کی طرف مائل ہوئے تو انہوں نے تمام اخلاقی حدود کو پھلانگ کر وحشت اور درندگی کی بدترین داستانیں رقم کیں۔ اگر ہم پاکستان بننے کے

بعد ان مظالم کا جائزہ لیں جو خود مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کے ظلم و ستم سے بچ کر آنے والے اپنے مسلمان بھائیوں پر کئے تو ہمیں صحیح معنوں میں الحاد کے اثرات کا اندازہ ہو گا۔ دور جدید میں اس کا اندازہ محض روزانہ اخبار پڑھنے ہی سے ہو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ملحدین میں جو خرابیاں پائی جاتی ہیں، وہ تو مسلمانوں نے پوری طرح اختیار کر لیں لیکن ان کی خوبیوں کا عشر عشیر بھی ان کے حصے میں نہ آیا۔

الحاد کے معاشرتی اثرات میں ایک بڑا واضح اثر خاندانی نظام کا خاتمہ اور فری سیکس کا فروغ ہیں۔ جنسی زندگی سے متعلق آداب انسان کو انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام ہی نے بتائے ہیں اور اس ضمن میں ہر قسم کی بے راہ روی کا خاتمہ کیا ہے۔ جب ایک شخص انہی کا انکار کر دے تو پھر اس کی راہ میں ایسی کونسی رکاوٹ ہے جو اسے دنیا کی کسی بھی عورت سے آزادانہ صنفی تعلقات سے روک سکے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ پھر ماں، بہن اور بیٹی کا تقدس پامال کرنے بھی کیا حرج رہ جاتا ہے؟ اس کے بعد اگر نئی نئی لذتوں کی تلاش میں مرد مردوں کے پاس اور عورتیں عورتوں کے پاس جائیں تو اس میں کیا قباحت رہ جاتی ہے؟

الحاد کا یہ وہ اثر ہے جسے مغربی معاشروں میں پوری طرح فروغ حاصل ہوا۔ دور غلامی میں خوش قسمتی سے مسلم دنیا الحاد کے ان اثرات سے بڑی حد تک محفوظ رہی لیکن بیسویں صدی کے ربع آخر میں میڈیا کے فروغ سے اب یہ اثرات بھی ہمارے معاشروں میں تیزی سے سرایت کر رہے ہیں۔ جہاں جہاں یہ فری سیکس پھیل رہا ہے وہاں وہاں اس کے نتیجے میں ایک طرف تو ایڈز سمیت بہت سی بیماریاں پھیل رہی ہیں اور دوسری طرف خاندانی نظام کا خاتمہ بھی ہو رہا ہے جس کے نتیجے میں کوئی نہ تو بچوں کی پرورش کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار ہے اور نہ ہی بوڑھوں کی خبر گیری کرنے کو۔ کڈز ہومز میں پلنے والے یہ بچے جب بڑے ہوتے ہیں تو اسی بے راہ روی کا شکار ہو کر یہ ذمہ داریاں قبول نہیں کرتے اور مکافات عمل کے نتیجے

میں یہ جب بوڑھے ہوتے ہیں تو پھر ان کی خبر گیری کرنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔ اچھے اولڈ ہومز میں داخلہ بھی اسی کو ملتا ہے جس کی اولاد کچھ فرمانبردار ہو اور اس اولڈ ہوم کا خرچ اٹھا سکے۔ ان کی زندگی اب کڈز ہوم سے شروع ہو کر اولڈ ہوم پر ختم ہو جاتی ہے۔

معاشرتی اور معاشی اعتبار سے الحاد نے مسلم معاشروں کو جس اعتبار سے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ دنیا پرستی کا فروغ ہے۔ دنیا پرستی کا فلسفہ مغربی اور مسلم دونوں علاقوں میں پوری آب و تاب کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ جب انسان عملی اعتبار سے آخرت کی زندگی کا انکار کر دے یعنی اس کے تقاضوں کو مکمل طور پر فراموش کر دے تو پھر دنیاوی زندگی کی اس کی سرگرمیوں کا مطمع نظر بن جاتی ہے۔ مغربی معاشروں پر تو کسی تبصرے کی ضرورت نہیں لیکن ہمارے اپنے معاشروں میں جس طرح دنیا پرستی کی بھیڑ چال شروع ہو چکی ہے، وہ ہماری پستی کی انتہا ہے۔

ایک طرف تو ایسے لوگ ہیں جن کی اخلاقی تربیت بہت ناقص ہے اور وہ ہر طرح کے جرائم میں مبتلا ہیں لیکن ان کے برعکس ایسے لوگ جن کی اخلاقی قدریں کافی حد تک قائم ہیں، دنیا پرستی کے مرض میں کس حد تک مبتلا ہو چکے ہیں، اس کا اندازہ صرف ان کی چوبیس گھنٹوں کی مصروفیات سے لگایا جا سکتا ہے۔ ہمارے عام تعلیم یافتہ لوگ جن کی اخلاقی سطح معاشرے کے عام افراد سے بلند ہے، روزانہ صبح اٹھتے ہیں اور اپنے کاروبار یا دفاتر کی طرف چلے جاتے ہیں۔ ان میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جو دفتری اوقات کے فوراً بعد واپس آجاتے ہوں۔ زیادہ سے زیادہ ترقی کے لئے لیٹ سٹنگز کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور عام طور پر لوگ آٹھ نو بجے تک دفتر سے اٹھتے ہیں۔ اس کے بعد گھر واپس آکر کھانا کھانے، ٹی وی دیکھنے اور اہل خانہ سے بات چیت گفتگو کرنے میں گیارہ بارہ بڑے آرام سے بج جاتے ہیں۔ سوتے سوتے ایک یا دو بج جاتے ہیں۔ بالعموم صبح کی نماز چھوڑ کر لوگ سات بجے تک بیدار ہوتے ہیں اور پھر دفتر کی تیاری

میں مل جاتے ہیں۔ چھٹی کا دن عموماً ہفتے بھر کی نیند پوری کرنے اور گھریلو مسائل میں نکل جاتا ہے۔ اب آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ ہم اللہ کو راضی کرنے، دین سیکھنے، اپنی اخلاقی حالت بلند کرنے اور دین کے تقاضے پورے کرنے کے لئے کتنا وقت نکال سکتے ہیں؟

افسوس ہے کہ اس ترقی کو حاصل کرنے کے لئے جو زیادہ سے زیادہ بیس پچیس سال تک کام دے گی، ہم لامحدود سالوں پر محیط آخرت کی زندگی کو نظر انداز کئے ہوئے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی اپنے کاروبار میں بیس روپے منافع کمانے کی دھن اربوں روپے کے سرمائے کا نقصان کرلے یا پھر دریا کی تہہ میں پڑے ہوئے ایک روپے کے سکے کو حاصل کرنے کے لئے لاکھوں روپے کی دولت پھینک کر دریا میں چھلانگ لگا دے۔

باب: 5

الحاد کی سائنسی اساسات کا انہدام

انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے نصف اول کا زمانہ الحاد کے عروج کا دور ہے۔ اسی دور میں وہ سائنسی تحقیقات ہوئیں جنھوں نے الحادی نظریات کی توجیہ پیش کی۔ اسی دور میں الحادی نظریات اور نظام ہائے حیات کو دنیا بھر میں فروغ ملا، اسی عرصے کے دوران دنیا بھر کے انسانوں نے اپنی زندگیوں میں مختلف درجوں پر الحاد کو قبول کیا۔ کوئی الحاد کو نظریاتی طور پر بھی مان کر خالص ملحد اور دہریہ بنا اور کسی نے صرف اس کے عملی اثرات کو قبول کرنے پر اکتفا کیا۔ بیسویں صدی کے نصف آخر سے الحاد کا زوال شروع ہوا۔

دور قدیم کے ملحدین کے پاس الحاد کی کوئی ٹھوس منطقی دلیل نہیں ہوا کرتی تھی۔ انیسویں صدی میں کچھ ایسے سائنسی نظریات وجود میں آئے جنھوں نے الحاد کو کسی حد تک سپورٹ کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں کسی کی حیثیت بھی سائنسی قانون (Law) یا مسلمہ کی نہیں تھی۔ یہ سب کے سب ابھی نظریے (Theory) کے درجے پر تھے۔ ان نظریات کا ایک مختصر جائزہ ہم پیش کر چکے ہیں، یہاں ہم ہارون یحیٰی کے مضمون The Fall of Atheism سے ان سائنسی تحقیقات کا اجمالاً ذکر کریں گے جنھوں نے الحاد کی ان سائنسی بنیادوں کو منہدم کیا۔ ان نظریات میں ڈارون کا نظریہ ارتقاء، فرائڈ کا نظریہ جنس، مارکس اور اینجلز کے معاشی نظریات اور ڈرخم کے عمرانی نظریات شامل ہیں۔ جو صاحب ان کی تفصیل جاننا چاہیں، وہ اس آرٹیکل کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ یہ آرٹیکل ان کی ویب

سائٹ www.harunyayha.org پر بھی میسر ہے۔ ان سائنسی اساسات کے انہدام پر جارج واشنگٹن یونیورسٹی کے پروفیسر پیٹرک گلائن کا تبصرہ بڑا معنی خیز ہے:

پچھلے دو عشروں کی ریسرچ نے جدید سیکولر اور ملحد مفکرین کی پچھلی نسل کے تمام مفروضات اور پیش گوئیوں کو گرا کر رکھ دیا ہے جو انہوں نے خدا کے وجود کے بارے میں قائم کئے تھے۔ جدید (ملحد) مفکرین نے یہ فرض کر رکھا تھا کہ سائنس پر مزید تحقیقات اس کائنات کو بے ترتیب (Random) اور میکانکی ثابت کر دیں گی؛ لیکن اس کے برعکس جدید سائنسی تحقیقات نے کائنات کو غیر متوقع طور پر ایسا منظم نظام ثابت کیا ہے جو کہ ایک ماسٹر ڈیزائن کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہو۔ ماڈرن (ملحد) ماہرین نفسیات یہ پیش گوئی کر رہے تھے کہ مذہب محض ایک دماغی خلل یا نفسیاتی بیماری ثابت ہو جائے گا لیکن انسان کا مذہب کے ساتھ تعلق مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں دماغی صحت کا اعلیٰ ترین نمونہ ثابت ہوا ہے۔ اس حقیقت کو ابھی صرف چند لوگ ہی تسلیم کر رہے ہیں لیکن یہ بات اب واضح ہو جانی چاہئے کہ مذہب اور سائنس میں ایک صدی کی بحث کے بعد اب پانسہ مذہب کے حق میں پلٹ چکا ہے۔ ڈارون کے نظریے کے فروغ کے دور میں، ملحدین اور تشککین جیسے ہکسلے اور رسل یہ کہہ سکتے تھے کہ زندگی اتفاقی طور پر وجود میں آئی اور کائنات محض ایک اتفاق ہی سے بنی۔ اب بھی بہت سے سائنس دان اور دانشور اسی نقطہ نظر کو مانتے ہیں لیکن وہ اس کے دفاع میں اب بے تکی باتیں کرنے پر ہی مجبور ہیں۔ آج حقائق کے مضبوط اعداد و شمار یہی ثابت کرتے ہیں کہ خدا کے موجود ہونے کا نظریہ ہی درست ہے۔

(Patrick Glynn, God: The Evidence, The Reconciliation of Faith and Reason in a Postsecular World , Prima Publishing, California, 1997, pp.19-20, 53)

بگ بینگ کا نظریہ

اب تک دنیا میں یہ مانا جارہا تھا کہ یہ کائنات ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اس نظریے کو جدید دنیا میں جرمن فلسفی عمانویل کانٹ نے پیش کیا۔ یہ سمجھا جانے لگا کہ اس کائنات کو کسی نے تخلیق نہیں کیا بلکہ یہ ہمیشہ سے ایسے ہی ہے۔

بیسویں صدی میں فلکیات (Astronomy) کے میدان میں جدید علمی تحقیقات نے اس نظریے کو غلط ثابت کر دیا۔ 1929 میں امریکی ماہر فلکیات ایڈون ہبل نے دریافت کیا کہ کہکشائیں مسلسل ایک دوسرے سے دور ہو رہی ہیں۔ اس سے سائنس دانوں نے یہ اخذ کیا کہ ماضی میں کسی وقت یہ کہکشائیں اکٹھی تھیں۔ اس وقت یہ کائنات توانائی کے ایک بہت بڑے گولے کی شکل میں موجود تھیں جو ایک بہت عظیم دھماکے (Big Bang) کے نتیجے میں مادے کی صورت اختیار کر گیا۔ ملحد مفکرین نے اس نظریے کو ماننے سے انکار کر دیا لیکن مزید سائنسی تحقیقات نے اس نظریے کو تقویت دی۔ 1960 کے عشرے میں دو سائنس دانوں ارنو پینزیاز اور رابرٹ ولسن نے دھماکے کے نتیجے میں بننے والی Cosmic Background Radiation کو دریافت کیا۔ اس مشاہدے کی تصدیق 1990 میں Cosmic Background Explorer Satellite کی ذریعے کی گئی۔ اس صورتحال میں انتھونی فلیو جو کہ یونیورسٹی آف ریڈنگ میں فلسفے کے ایک ملحد پروفیسر ہیں، کہتے ہیں:

> اعتراف روح کے لئے اچھی چیز ہے۔ میں اس اعتراف سے آغاز کرتا ہوں کہ علم فلکیات میں اس اتفاق رائے سے ایک ملحد کے نظریات پر زد پڑتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ فلکیات دان اس بات کو سائنسی طور پر ثابت کرنا چاہتے ہیں جو سینٹ تھامس فلسفیانہ طور پر ثابت نہ کر سکے یعنی یہ کہ اس کائنات کی کوئی ابتدا ہے۔ اس سے پہلے

ہم یہ اطمینان رکھتے تھے کہ اس کائنات کی نہ تو کوئی ابتدا ہے اور نہ کوئی اختتام---
---اب یہ کہنا بگ بینگ تھیوری کے سامنے آسان نہیں۔

(Henry Margenau, Roy Abraham Vargesse, Cosmos, Bios, Theos, La Salle IL: Open Court Publishing, 1992, p.241)

جان میڈکس جو کہ ایک ملحد ہیں اور Nature کے نام سے رسالہ نکالتے ہیں نے اس نظریے کو اس بنیاد پر رد کر دیا کہ اس سے خدا کو ماننے والوں کو حجت مل جائے گی۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ یہ نظریہ دس سال سے زیادہ نہیں چل سکے گا لیکن مزید تحقیقات نے اس نظریے کو اور تقویت دی۔ برطانوی ملحد اور ماہر طبیعات ایچ پی لیپسن لکھتے ہیں:

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس بات کا اعتراف کر لینا چاہئے کہ قابل قبول تشریح یہی ہے کہ اس کائنات کو تخلیق کیا گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ملحدین کی زبان بند کر دے گی جیسا کہ میرے ساتھ ہوا لیکن ہمیں کسی چیز کو صرف اس بنیاد پر رد نہیں کر دینا چاہئے کہ ہم اسے پسند نہیں کرتے اگرچہ تجربہ اور مشاہدہ اسے ثابت کر رہا ہو۔

(H. P. Lipson, "A Physicist Looks at Evolution", Physics Bulletin, vol. 138, 1980, p. 138)

کائنات کا انٹیلی جنٹ ڈیزائن

کائنات کے متعلق اہل الحاد کا ایک اور نظریہ بھی تھا اور وہ یہ تھا کہ یہ کائنات بے ترتیب (Random) ہے۔ اس میں موجود مادے، اجرام فلکی اور جن قوانین کے تحت یہ چل رہے ہیں کا کوئی مقصد نہیں بلکہ یہ محض اتفاق ہی ہے۔ 1970 کے عشرے میں

سائنس دانوں نے یہ دریافت کیا کہ کائنات میں ایسا توازن (Balance) پایا جاتا ہے جس میں اگر ذرا سا بھی ہیر پھیر ہو تو اس میں انسانی زندگی ممکن ہی نہ ہو سکے۔ تمام طبیعی، کیمیائی اور حیاتیاتی قوانین، کشش ثقل اور مقناطیسی قوتیں، ایٹمز اور مالیکیولز کی ساخت، عناصر اور مرکبات کی موجودگی یہ سب کا سب بالکل اسی طرح اس کائنات میں موجود ہے جیسا کہ انسانی زندگی کی ضرورت ہے۔ سائنس دانوں نے اس غیر معمولی ڈیزائن کو Anthropic Principle کا نام دیا۔ ان کے مطابق اگر بگ بینگ کے وقت دھماکے کی شدت، مادے کے پھیلنے کی رفتار میں ذرا سا بھی فرق پڑ جاتا تو یا تو مادہ دوبارہ جڑ جاتا یا پھر اتنا زیادہ پھیل جاتا کہ موجودہ حالت میں کسی طور پر آ ہی نہ سکتا، اس طرح انسانی زندگی کبھی ممکن نہ ہوتی۔

زمین کا سائز، سورج کا سائز، سورج اور زمین کا فاصلہ، پانی کی طبعی اور کیمیائی خصوصیات، سورج کی شعاعوں کی ویولینتھ، زمین کی فضا میں موجود گیسیں اور کشش ثقل سب کی سب اسی تناسب میں موجود ہیں جو انسانی زندگی کے لئے ہونا چاہئے تھا۔ اگر ان میں سے کسی میں 1039/1 کے برابر بھی فرق پڑ جاتا تو انسانی زندگی ممکن نہ ہوتی۔ کیا ایسا کسی مافوق الفطرت ہستی کی مداخلت کے بغیر ممکن تھا۔ کیا دنیا میں کبھی ایسا ہوا کہ ہوا میں ریت، بجری اور سیمنٹ کو یونہی اچھال دیا جائے اور وہ جب زمین پر بیٹھے تو ایک خوبصورت بنگلے کی صورت اختیار کر جائے جو انسانی رہائش کے لئے موزوں ترین ہو یا پھر روشنائی کے قطروں کو اچھال دیا جائے اور جب وہ نیچے گریں تو غالب کی غزل لکھی ہوئی ہو۔ شاید ایسا صرف کارٹون فلموں ہی میں ممکن ہے لیکن حقیقی دنیا میں اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایک منظم نتیجہ حاصل کرنے کے لئے کسی برتر ہستی کی موجودگی ضروری ہوا کرتی ہے۔ ان حقائق نے بہت سے سائنس دانوں جیسے پال ڈیوس، ڈبلیو پریس، جارج گرین اسٹائن اور مالیکیولر بائیولوجسٹ

مائیکل ڈینٹن کو کسی برتر ہستی کا اعتراف کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔

ڈارون کے نظریے کی تردید

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ الحاد کو سب سے زیادہ سپورٹ ڈارون کے نظریہ ارتقا سے ملی ہے۔ ڈارون کے مطابق تمام جاندار اشیا بے جان مادے سے ایک ارتقائی عمل کے تحت بنی ہیں۔ سب سے پہلے ایک خلیے پر مشتمل سادہ جاندار وجود میں آئے اور پھر یہ لاکھوں سال میں نسل در نسل ارتقا پذیر ہو کر اعلیٰ جانوروں کی شکل اختیار کرتے گئے۔ بیسویں صدی میں پیلی انٹالوجی کے میدان میں قدیم ترین فوسلز پر ریسرچ سے نظریہ ارتقا کسی طرح بھی ثابت نہ ہو سکا۔ یہ ریسرچ مختلف جانوروں کے درمیان ارتقا کڑیوں کو جوڑنے میں ناکام رہی۔

اسی طرح جانوروں کی نسلوں میں کئی عشروں تک تبدیلیوں کے مطالعے سے سائنس دان اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کسی بھی نوع (Specie) میں تبدیلیاں مخصوص جینیاتی حدود (Genetic Boundries) سے باہر نہیں جاتیں۔ انسانی آنکھ سے لیکر پرندوں کے پروں تک کسی بھی جاندار کے جسم کا ہر حصہ اتنی sophisticated technology سے بنا ہوتا ہے کہ اس کا تقابل کسی بھی جدید مشینری سے کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے یہ ماننا بہت مشکل ہے کہ یہ سب کچھ محض اتفاق ہی سے اندھے قوانین کے تحت بن گیا۔ ان تمام تحقیقات کے نتیجے میں اب مغربی سائنس دانوں میں Intelligent Design کا نظریہ فروغ پا رہا ہے۔

سگمنڈ فرائڈ کے نظریات کی تردید

نفسیات کے میدان میں الحاد کی اساسات سگمنڈ فرائڈ کے نظریات پر قائم تھیں جو کہ آسٹریا کے ماہر نفسیات تھے۔ فرائڈ مذہب کو محض ایک نفسیاتی بیماری قرار دیتے تھے اور ان کا خیال یہ تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ انسان جیسے جیسے ترقی کرے گا، یہ مرض دور ہو جائے گا۔ ماہرین نفسیات میں الحاد بہت تیزی سے پھیلا۔ 1972 میں امریکن سائکالوجی ایسوسی ایشن کے ممبرز کے مابین ایک سروے کے مطابق ماہرین نفسیات میں صرف 1.1٪ ایسے تھے جو کسی مذہب پر یقین رکھتے ہوں۔ انہی ماہرین نفسیات نے طویل عرصے تک لوگوں کی نفسیات کا مطالعہ کرنے کے بعد جو رائے قائم کی، وہ پیٹرک گلائن کے الفاظ میں کچھ یوں تھی:

> نفسیات کے میدان میں پچیس سالہ ریسرچ نے یہ ظاہر کیا ہے کہ فرائڈ اور ان کے پیروکاروں کے خیال کے برعکس، مذہب پر ایمان ذہنی صحت اور خوشی کے اہم ترین اسباب میں سے ایک ہے۔ ریسرچ پر ریسرچ یہ ثابت کرتی ہے کہ مذہب پر ایمان اور اس پر عمل انسان کو بہت سے غیر صحت مندانہ رویوں جیسے خودکشی، منشیات کے استعمال، طلاق، ڈپریشن اور شادی کے بعد جنسی عدم تسکین سے بچاتا ہے۔ مختصراً، مشاہداتی ڈیٹا پہلے سے فرض کردہ سائیکو تھیراپک اجماع سے بالکل مختلف نتائج پیش کرتا ہے۔

(Patrick Glynn, God: The Evidence. The Reconciliation of Faith and Reason in a Postsecular World , Prima Publishing, California, 1997, pp.60-61 (

کمیونزم کا زوال

معاشیات کے میدان میں الحاد کی سب سے بڑی شکست کمیونزم کا زوال ہے۔

کمیونزم جو دنیا میں الحاد کا سب سے بڑا داعی تھا، بالآخر اپنے دو بنیادی مراکز روس اور چین میں دم توڑ گیا۔ لینن نے اپنے تئیں خدا کو سوویت یونین سے نکال دیا تھا لیکن خدا نے اس کے غرور کا خاتمہ کر ہی دیا۔ کمیونزم کے آخری دور میں روسی عوام اور آخری صدر گورباچوف کو خدا کی ضرورت بری طرح محسوس ہوئی۔ سیاسیات کے باب میں الحاد کی بنیاد پر بننے والے نظریات فاشزم وغیرہ بھی دم توڑ گئے۔

معاشریات یا عمرانیات (Sociology) کے اعتبار سے الحاد اہل مغرب کو سکون فراہم کرنے میں ناکام رہا۔ یہ بے سکونی اس قدر بڑھی کہ وہاں ہپی تحریک نے فروغ پایا جو دنیا کی ذمہ داریوں سے جان چھڑا کر منشیات کے نشے میں مست پڑے رہتے اور سکون کی تلاش میں سرگرداں رہتے حتیٰ کہ بعض تو اسی حالت میں اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے۔

یہ چند مثالیں ہیں جو بیسویں صدی کی جدید سائنسی تحقیقات کی نتیجے میں الحادی نظریات کی تردید میں آپ کے سامنے پیش کی گئیں۔ ان میں سے اگر صرف کائنات کے توازن اور اس کے عین انسانی ضروریات کے مطابق ہونے ہی کو لیا جائے تو خدا کے وجود کا معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ اس میں بعض چیزیں تو اتنی بدیہی ہیں کہ ان کو جاننے کے لئے کسی سائنسی تحقیق کی ضرورت نہیں بلکہ دیہات میں رہنے والے عام انسان بھی ان کو سوچ اور سمجھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں تفصیلی سائنسی دلائل کی بجائے بالعموم ایسی چیزوں سے استدلال کیا گیا ہے جو ہر دور اور ہر ذہنی سطح کے لوگوں کی سمجھ میں آ جائیں۔

دور جدید میں کائنات کا علم یعنی فلکیات ہو یا انسان کی اپنی ذات کا علم یعنی حیاتیات و نفسیات، جیسے جیسے انسان پر حقائق منکشف ہو رہے ہیں، وہ جانتا جا رہا ہے کہ واقعی اس کائنات کا خدا اور اس کا کلام حق ہے۔ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (حم سجدہ 41:53) "ہم عنقریب انہیں (انسانوں کو) اس کائنات اور اور خود ان کی ذات

(جسم وروح) میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ (قرآن) حق ہے۔"

اس موقع پر ہم یہ عرض کرنا مناسب سمجھتے ہیں کہ اثبات خدا سے متعلق سائنسی دلائل دیتے ہوئے ہمیں صرف ان چیزوں سے استدلال کرنا چاہیے جن کی حیثیت سائنس میں حتمی قانون (Law) یا مسلمات کی ہو۔ اگر ہم بھی ملحدین کی طرح محض سائنسی نظریات (Theories) سے استدلال کرنے لگیں گے تو عین ممکن ہے کہ کل وہ نظریات بھی غلط ثابت ہو جائیں اور ہمارا استدلال غلط قرار پائے۔

باب: ۵

الحاد، اکیسویں صدی اور ہماری ذمہ داریاں

جیسا کہ ہم نے مطالعہ کیا کہ انیسویں صدی میں جب سائنسی علوم نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ انسان ان کی بنیاد پر کوئی حتمی رائے قائم کر سکتا، بعض خام سائنسی نظریات نے ملحدین کو خدا کا انکار کرنے کا جواز عطا کیا۔ بیسویں صدی میں جب انسان کی علمی سطح بلند ہوئی تو اسے اپنے نظریات کی غلطی کا علم ہوا۔ بہت سے ایسے حقانیت پسند ملحد مفکرین اور سائنس دانوں جن میں پیٹرک گلائن بھی شامل ہیں، نے خدا کا اقرار کر لیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نظریاتی میدان میں اب الحاد کو شکست حاصل ہو چکی ہے۔ لیکن عملی میدان میں الحاد اب بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ موجود ہے اور اس ضمن میں مغربی اور مسلم دنیا کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ مغربی دنیا میں تو پھر بھی اخلاقی اصولوں کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے لیکن اس کے برعکس مسلم دنیا اخلاقی اعتبار سے بہت پیچھے ہے۔

اگر غور کیا جائے تو موجودہ دور میں صورتحال اتنی مایوس کن بھی نہیں ہے۔ ہمارے معاشروں میں تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ دین کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور بالخصوص ذہین لوگ بڑی کثیر تعداد میں دین کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ تعلیم یافتہ افراد کی اخلاقی حالت بھی بالعموم غیر تعلیم یافتہ افراد سے نسبتاً خاصی بہتر ہوتی جا رہی ہے۔ اہل مغرب میں بھی دوبارہ خدا کی طرف رجوع کرنے کا رجحان موجود ہے۔ یہ بات بعید از قیاس نہ ہوگی کہ جس طرح بیسویں صدی میں الحاد کو نظریاتی میدان میں شکست ہوئی، اسی طرح اکیسویں صدی میں انشاء اللہ الحاد کو عملی میدان میں بھی شکست ہونے کا خاصا امکان موجود

ہے۔ اس ضمن میں جو لوگ اللہ، رسول اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، ان پر بھی چند ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اگر اہل ایمان ان ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو جاتے ہیں تو امید کی جاسکتی ہے کہ عمل کے میدان میں بھی الحاد کو شکست ہو گی۔

اہل ایمان کو سب سے پہلے اپنا ہدف متعین کر لینا چاہیے۔ اس وقت جو لوگ دین کی خدمت کر رہے ہیں، ان کا ہدف بالعموم اتنا جامع اور متعین نہیں ہے۔ عام علماء بس کسی طرح اپنے روایتی ورثے کی حفاظت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بعض دینی جماعتوں نے اپنا ہدف سیاسی نظام کی تبدیلی تک محدود کر لیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سیاسی نظام کی تبدیلی کے بعد کے مسائل پر کسی نے غور کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی اس کے لئے کوئی ایکشن پلان تیار کرنے کی کسی نے زحمت کی ہے۔ اگر یہ لوگ اسلام کی بنیاد پر دور جدید کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی ماڈلز تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوتے تو اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ موجودہ حکمرانوں میں سے کوئی اسے نافذ کرنے پر تیار ہو جاتا۔

اس کے برعکس بعض دینی جماعتوں کا ہدف لوگوں کو چند مخصوص دینی اعمال جیسے نوافل، ورد و وظائف اور عبادات کی تلقین کرنا رہ گیا ہے۔ دین کا کلی تصور ان کے ہاں بھی مفقود ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دین شرک سب سے بڑا فتنہ تھا اور آپ کی دعوت کا بنیادی ہدف شرک کا خاتمہ تھا، اسی طرح موجودہ دور میں "الحاد عملی" سب سے بڑا فتنہ اور اس کے خاتمہ اہل ایمان پر لازم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو کسی دوسرے مذہب سے اتنا بڑا خطرہ لاحق نہیں ہے جتنا کہ الحاد سے جو دنیا پرستی اور اخلاقی انحطاط کی صورت میں ملت اسلامیہ کے قلب میں جڑ پکڑ چکا ہے۔ آج کی ہر دینی جدوجہد کا بنیادی ہدف اس الحاد کی جڑ پر تیشہ چلانا ہونا چاہیے۔

یہ حقیقت بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اسلام پسند افراد اور تحریکیں الحاد کی بنیاد پر قائم

ہونے والے نظریات جیسے جمہوریت، سیکولرازم اور کیپیٹل ازم وغیرہ کے اسلامی بنیادوں پر قائم ایسے مربوط اور ترقی یافتہ متبادل پیش نہیں کر سکے جو دور جدید میں مکمل طور پر قابل عمل ہوں۔ اس معاملے میں امت کے مختلف حلقوں کی جانب سے بہت سی کوششیں ہوئی ہیں اور مسلسل ہو رہی ہیں۔ اس وقت اس چیز کی ضرورت ہے کہ اسلامی تعلیمات کی اساس پر دور جدید کے تقاضوں کے مطابق قابل عمل سیاسی، معاشی اور عمرانی ماڈلز تیار کئے جائیں اور امت کے ذہین ترین افراد علوم اسلامیہ میں اجتہادی بصیرت پیدا کر کے اس عمل میں حصہ لیں۔ اب تک اس ضمن میں جو کام ہو چکا ہے، اس کا مسلسل تنقیدی جائزہ لیتے رہنے کی ضرورت ہے تاکہ ان ماڈلز کو بہتر بنایا جا سکے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے، تجربے کی کسوٹی پر انہیں پرکھنے کی ضرورت ہے تاکہ ان میں مزید بہتری لائی جا سکے۔ الحمد للہ امت کے ذہین ترین افراد اس عمل میں مصروف ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کا حصول بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ پوری امت کے مزاج کو علمی اور معقول (Rational) بنانے کی ضرورت ہے جیسا کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں اور آج کل کے اہل مغرب کا مزاج علمی اور عقلی ہے۔ تاریخ میں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ جب ہم علم و دانش کی بلندیوں کو چھو رہے تھے اور اہل مغرب علم، دانش سے کوسوں دور تھے تو ہمارا دور عروج تھا اور جب ہم علم و دانش سے دور ہوئے اور اہل مغرب نے اسے اختیار کیا تو دنیا میں ان کا عروج اور ہمارا زوال شروع ہوا۔ اہم ترین ذمہ داریوں میں یہ بھی شامل ہے کہ امت مسلمہ کے اخلاق کو کردار کو بہتر بنانے کی بھی کوشش کی جائے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ملحدین کی بجائے مسلمان خود کو عملی طور پر اعلیٰ انسانی اخلاقیات کا چیمپئن ثابت کریں۔ مسلمانوں میں ایک بھرپور انسانی تحریک (Humanist Movement) پیدا کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

اس ضمن میں نہ صرف یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا خود جائزہ لیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ امت مسلمہ سے باہر ہمارا کیا تاثر پایا جاتا ہے۔ اس میں کیا کیا منفی عوامل شامل ہیں؟ ہم میں ایسی کونسی حقیقی کمزوریاں موجود ہیں جو غیر مسلموں کی نظر میں ہمارے امیج کو خراب کرتی ہیں؟ کیا ہم اسلام کے حقیقی داعی اور مبلغ کا کردار ادا کر رہے ہیں یا ہماری حیثیت بھی بہت سی قوموں کے ہجوم میں محض ایک عام سی قوم کی ہے جو سب کی طرح صرف اپنے ہی حقوق کے لئے مری جارہی ہو؟ اپنی اخلاقی کمزوریوں کو دور کر کے ایک داعی و مبلغ کا اعلیٰ ترین کردار پوری دنیا کے سامنے پیش کرنا بہت بڑا جہاد ہے جس کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں اس تنقید کا مطالعہ بہت ضروری ہے جو ملحدین اور دوسرے غیر مسلم مفکرین نے مسلمانوں کے کردار پر کی ہے۔ اگر ان خطوط پر کام کیا جائے تو امید کی جاسکتی ہے کہ ہم آنے والے دور میں الحاد کا بہتر مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے۔

اس معاملے میں اچھی بات یہ ہے کہ امت مسلمہ میں اب یہ احساس پیدا ہو چلا ہے کہ منفی انداز میں ہم نے بہت کچھ کر کے دیکھ لیا مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ اب مثبت انداز میں جد وجہد کی جائے۔ متعدد ایسے دینی ادارے وجود میں آرہے ہیں جہاں عصر حاضر کے ان تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا۔ دنیا کے تقریباً سبھی ممالک میں امت کے بہت سے ذہین افراد اسلام کو درپیش چیلنجز پر کام کر رہے ہیں۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ان افراد یا اداروں کے ساتھ ہر ممکن طریقے سے تعاون کریں اور اس مثبت جد وجہد کو آگے بڑھائیں۔

باب:7

ایتھی ازم کے اسلام پر سوالات اور ان کے جوابات

ہمارے زمانے میں ایتھی ازم کے ملحدین ایسے سوالات پیدا کرتے ہیں جن کا تعلق اللہ تعالی کی ذات کے بارے میں ہے۔ انہی سوالات سے بعض مسلم نوجوان متاثر ہوتے ہیں کیونکہ مذہبی علما اس کے جوابات نہیں دے سکتے ہیں۔ ایسے مذہبی علما جو اس زمانے میں جدید علوم جانتے ہیں، انہیں چاہیے کہ ان ملحدین کے سوالات کے جوابات کو مثبت انداز میں ایسے طریقے سے بیان کرنا چاہیے تاکہ جدید تعلیم یافتہ نسل ان جوابات کو پڑھ کر ملحدین کے سوالات کے اثرات سے بچ سکیں۔ یہاں پر ہم چند ایتھی ازم کے سوالات پیش کر رہے ہیں جن سے کے جوابات یہاں پر حاضر ہیں۔

سوال: مذہبی معاملات کو لوگوں سے الگ کرنا چاہیے۔ دنیاوی معاملات کو ہمیں مذہب سے آزاد کرنا چاہیے تاکہ لوگ اپنی زندگی سے جیسے چاہیں کر لیں اور اس میں لوگوں پر مسلط نہ کریں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ لوگ دوسروں کو روکتے ہیں کہ وہ شراب نہ پئیں کہ یہ دین میں حرام ہے۔ اس طرح مذہبی لوگ شراب، جوا، لڑکے لڑکیوں میں شہوت وغیرہ کو قانونی طور پر ختم کرتے ہیں جس کی وجہ سے معیشت خراب ہوتی ہے اور ان کی زندگی میں مزا ختم ہو جاتا ہے۔

جواب: دین میں یہ حکم نہیں دیا گیا کہ ہم لوگوں پر زبردستی کر کے ان میں لوگوں پر مسلط کر دیں کہ وہ دین کے مطابق عمل کریں۔ قرآن مجید میں ہمیں بس اتنا حکم دیا گیا ہے کہ ہم لوگوں تک محبت کے ساتھ دعوت پہنچا دیں۔ دین کے ارشادات کو لوگوں تک محبت سے پہنچا دیں اور بس۔ اگر ان میں ایمان مضبوط ہو گا تو پھر یہ لوگ خود دین کے مطابق عمل کریں گے۔

یہ درست ہے کہ ہمارے بعض مذہبی گروپ یہ غلطی فہمی سے سمجھتے ہیں کہ ہم لوگوں پر دین نافذ کریں۔ پھر یہ لوگوں پر مارتے پیٹتے اور قتل کر لیتے ہیں۔ یہ حکم دین میں نہ تو قرآن مجید میں دیا گیا ہے اور نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں ارشاد فرمایا ہے کہ ہم لوگوں پر دین کو مسلط کر دیں۔ ہماری ذمہ داری صرف اتنی ہے کہ ہم لوگوں تک محبت کے ساتھ تلقین کر دیا کریں۔ آپ قرآن مجید کا مطالعہ خود کر سکتے ہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے:

اُدۡعُ اِلٰى سَبِيۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ‌ وَجَادِلۡهُمۡ بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ‌ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِيۡلِهٖ‌ وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ. وَاِنۡ عَاقَبۡتُمۡ فَعَاقِبُوۡا بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبۡتُمۡ بِهٖ‌ وَلَئِنۡ صَبَرۡتُمۡ لَهُوَ خَيۡرٌ لِّلصّٰبِرِيۡنَ

اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت، حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ بہت بہترین طریقے سے لوگوں سے بات کیجیے۔ آپ کا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہ راست پر ہے۔ (اگر آپ سے کوئی زیادتی کرے تو) آپ اس کا بدلہ لے سکتے ہیں اگر آپ زیادتی کی گئی ہو۔ لیکن اگر آپ صبر کریں تو یقیناً

یہ صبر کرنے والوں کے لیے ہی حق میں بہتر ہے۔ (سورۃ النحل 16:125 to 126)

آپ نے جو مثالیں دی ہیں کہ مذہبی لوگ شراب، زنا اور جوا سے قانونی طور پر روکتے ہیں اور اس کی وجہ سے معیشت خراب ہوتی ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شراب، زنا اور جوا کی وجہ سے معیشت خود خراب ہوتی ہے اور اسی سے لوگوں پر بہت سے نقصانات ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے ان برائیوں سے روکا جائے تو معیشت خراب ہوتی ہے بلکہ اس سے معیشت خود بہتر ہوتی ہے۔ آپ خود سمجھتے ہیں کہ دنیا کے تمام ممالک میں حکومت سے ایسی چیزوں کو روکا جاتا ہے جس سے بعض لوگوں کو تو معاشی فائدہ حاصل ہوتا ہے لیکن اس کے نتیجے میں اکثر لوگوں پر شدید نقصان آتا ہے۔

مثلاً شراب کو دیکھیے تو جو لوگ اس کے عادی ہو جاتے ہیں تو ان کا ذہن پھر استعمال نہیں کرتا ہے۔ اس شراب کی وجہ سے نشے میں رہ کر بغیر سوچے سمجھے اپنی بیٹیوں سے بدکاری کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح جو شوہر اور بیگم کی بجائے دوسرے لوگوں سے شہوت پوری کرتے ہیں تو وہ خود بہت سی بیماریوں میں شامل ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہی بیماریاں دیگر لوگوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ جوا کی عادت میں لوگ اپنی معیشت کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد پھر جوا ہار کر اپنی بیگم اور بیٹیوں کو دوسروں پر بیچ دیتے ہیں۔ یہ ایسے مسائل ہیں جو کہ نہ صرف دین بلکہ دنیاوی اعتبار سے شدید نقصان دہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیندار لوگ اپنی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ایسا قانون بنائیں تاکہ لوگوں کے ساتھ زیادتی نہ کی جائے۔

سوال: ہم پر تو ہمارے والدین اور مذہبی علما ہمیں کہہ دیتے ہیں کہ خدا ہے؟ ہمیں کیسے یقین آئے کہ وہ سچ کہہ رہے ہیں؟ ہمیں تو لگتا ہے کہ یہ محض ایک وہم ہے جو ہمارے والدین اور مذہبی طبقہ کی طرح سے پھیلا ہوا ہے۔ یہ تو ہمیں مارتے پیٹتے ہیں کہ ہم خدا پر ایمان کریں

نہیں مانتے؟ خدا کا وجود ہمیں ثابت نہیں ہوتا ہے۔ سائنس سے ہمیں معلوم نہیں ہے کہ خدا موجود ہے اور وہ ہم پر احکامات دیتے ہیں۔ ہم پھر کس طرح سے خدا پر ایمان رکھ سکتے ہیں؟

جواب: یہ ایک غلط فہمی آپ پر سمجھی جاتی ہے کہ والدین اور مذہبی علماہی ہمیں خدا پر ایمان زبردستی مانتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ عقل ہمارے اپنے ذہن میں سمجھا دیتی ہے کہ ایک خدا ہے جس نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ آپ خود یہ یاد کیجیے کہ بچپن میں آپ کے ذہن میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز بھی خود بخود نہیں بن سکتی ہے بلکہ اس کا کوئی خالق ہوتا ہے۔ آپ سوچیے کہ گھر میں چارپائی، پنکھا، فرج، کھانا وغیرہ خود بخود بن سکتی ہیں؟ ان سب چیزوں کو کوئی انسان ہی بناتا ہے تو تب یہ چیزیں ہمیں پیدا ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح ہمارے اپنے جسم اور شخصیت کو اللہ تعالی پیدا کرتا ہے۔ یہ محض ایک وہم نہیں ہوتا ہے بلکہ خود ہماری شخصیت میں ذہن کے ڈیٹا میں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ ہمیں ایک خالق یعنی اللہ تعالی نے پیدا کیا ہے۔ والدین اور مذہبی علما بس اس بات کو دوسروں تک پہنچا دیتے ہیں اور ہمارا اپنا ذہن اسے پورے دل کے ساتھ اس پر مان لیتا ہے کہ اللہ تعالی موجود ہے اور وہی ہر چیز کو اس نے پیدا کیا ہے۔ آپ کے لیے خود یہی دلیل ہے کہ آپ بچپن میں یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اسے اللہ تعالی نے پیدا کیا ہے۔ اسی طرح آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ پوری زمین، سورج، چاند، ستارے اور سیارے پیدا ہوئے ہیں جبکہ کسی ایک انسان نے اسے مشین سے پیدا نہیں کیا ہے۔ اس سے ہماری عقل فوراً سمجھا دیتی ہے کہ اس پوری کائنات کو اللہ تعالی ہی نے پیدا کیا ہے۔

سوال: انتھروپولوجی (Anthropology) کے ماہرین نے ہمیں بتایا ہے کہ کائنات خود بخود بن گئی ہے۔ ہمیں بچپن میں سائنس کی کتاب میں پڑھا تھا کہ مادہ (Matter) نہ تو پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی تباہ ہوتا ہے۔ یہ صرف اتنا ہوتا ہے کہ یہ مادہ کسی طاقت (Anergy) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح دیکھتے ہیں کہ مقناطیس کے ذریعے طاقت سے دوسری

چیزوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح ہم گیند کو اوپر کریں تو زمین اسے کھینچ
تی ہے۔ بالکل اسی طرح کائنات میں مختلف حصوں نے ایک دوسرے کو کھینچ لیا اور اس سے
ستارے اور سیارے بن گئے۔ اس سے خدا کا ثبوت کیسے ملتا ہے؟

جواب: آپ خود دیکھیے کہ جب بھی آپ عقل کے ساتھ محنت کرتے ہیں تو تب ہی کھانا بنتا
ہے۔ ہم اپنی مشینوں کو تیار کرتے ہیں تو تب ہی مشین بنتی ہے اور اس سے اور چیزیں پیدا ہوتی
ہے۔ جب چھوٹی موٹی چیز خود نہیں بن سکتی تو اتنی بڑی کائنات خود بخود کیسے بن گئی۔ آپ بتا
رہے ہیں کہ کائنات میں مختلف اشیا نے ایک دوسرے سے کھینچا تو پھر ستارے و سیارے بن
گئے۔ اب سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ اسے کھینچا کس نے؟

جب ہماری عقل ہی بتاتی ہے کہ اسے اللہ تعالی نے کھینچا ہے اور نہ صرف کھینچا ہے بلکہ اس کا یہ
قانون بھی بنا دیا ہے کہ مقناطیس ایک دوسرے کو کھینچتا یا پھر دور کرتا ہے۔ دنیا میں تو ہم نے
دیکھا ہے کہ حکومت ہی قانون بناتی ہے ورنہ کوئی قانون موجود میں نہیں ہوتا ہے۔ بالکل اسی
طرح اللہ تعالی ہی نے اس پوری کائنات کے اندر قوانین (Laws) تیار کر دیے ہیں جس
کے مطابق پوری طاقت چلتی ہے۔ بغیر قانون خود بخود نہیں بن سکتا ہے بلکہ اسے تیار کرنے
کی ضرورت ہے اور پوری کائنات کو ایک انسان نہیں سنبھال سکتا ہے۔

الحاد اور جدید ذہن کے سوالات

از

حافظ محمد شارق

الحاد کا تعارف

دنیائے مذاہب میں بنیادی طور پر دو قسم کے عقائد سبھی کے ہاں کچھ اختلافات کے ساتھ یکساں طور پر موجود ہیں: وجود خداوندی اور فرستادگانِ خدا کا تصور جسے پیغمبر، تیر تھنکر، بدھ ، اوتار اور دیگر ناموں سے جانا جاتا ہے۔ یہ دو عقائد تقریباً سبھی مذاہب میں موجود ہیں۔ ان دونوں عقیدوں کا ماحصل یہ ہے کہ اس کائنات کو خدا نے تخلیق کیا ہے اور تخلیق کرنے کے بعد وہ اس کائنات سے لاتعلق نہیں ہوا بلکہ اس کائنات کا نظام چلا رہا ہے اور اس کی مسلسل نگرانی سے روگردانی نہیں کرتا۔ اسی کے ساتھ اس نے انسانوں کو اچھے اور برے کی تمیز کا شعور ایک حاسہء اخلاقی کی صورت اس کے نفس میں ودیعت کر دیا ہے جسے فطرت کہتے ہیں۔ مزید بر آں خدا کی طرف سے چند عملی نمونے بھی ایسے آئے جن کے مطابق انسانوں کو اپنی زندگی گزارنا چاہیے۔ چند ایک مذاہب کو چھوڑ کر سبھی اہم مذاہب میں آخرت کا تصور بھی ہے جس کے مطابق اچھے اعمال کرنے والوں کے لیے جنت اور برے اعمال کرنے والوں کے دوزخ ہے۔

مذہب کے متعلق ان عمومی عقائد کے خلاف ایک اور طرز فکر رائج رہا ہے جسے الحاد یا عمومی طور پر لادینیت کہا جاتا ہے۔ الحاد در حقیقت کوئی مذہب نہیں بلکہ ایک طرزِ فکر کا نام ہے جو خدا پر عدم یقین سے تعلق رکھتا ہے۔ الحاد کے قائل یعنی خدا اور مذہب پر یقین نہ رکھنے والوں کو ملحد کہا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک خدا، دیوتا یا مافوق الفطرت ہستیوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔

لہٰذا مذہب بھی کوئی الہامی حقیقت نہیں رکھتا بلکہ انسان کی اپنی سوچ و فکر کا نتیجہ اور اس کے ذہن ن اختراع ہے۔

الحاد (Atheism)

It (Atheism) is the belief that there is no God or gods.[1]

Atheism سے مراد کسی بھی صورت میں ایک قادر مطلق ہستی کا مطلقاً انکار کرنا ہے چاہے وہ ایک واحد ہستی کی صورت میں مانا جائے یا متعدد دیوتاؤں کی صورت میں۔ اس نقطۂ نظر کے حامل لوگوں کو Atheist یعنی ملحد کہا جاتا ہے۔

دورِ حاضر میں الحاد کی تین بڑی قسمیں ہیں جنھیں مروجہ اصطلاحات میں Agnosticism، Deism، اور Gnosticism کہا جاتا ہے۔

الحاد مطلق (Gnosticism)

Gnosticism سے مراد معرفت یا علم رکھنا ہے۔ یہ ملحدین خدا کے انکار کے معاملے میں شدت کا رویہ رکھتے ہیں۔ یہ لوگ روح، دیوتا، فرشتے، جنت و دوزخ اور مذہب سے متعلقہ روحانی اموراور مابعد الطبعیاتی (Meta-physical) امور کو کسی بھی صورت تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اس بات کا اچھی طرح علم رکھتے ہیں کہ انسان اور کائنات کی تخلیق میں کسی خالق کا کمال نہیں ہے بلکہ یہ خود بخود وجود میں آئی ہے اور فطری قوانین (Laws of nature) کے تحت چل رہی ہے۔ اس نقطۂ نظر کے حامل لوگوں کو

[1] Julian Baggini, Atheism: **A Very Short Introduction,** (Oxford University press, 2003) P-3 (www-lightforcenetwork-com)

Gnostic Atheist کہا جاتا ہے۔ عام طور پر جب ملحدین یعنی اتھیسٹ کا ذکر ہوتا ہے تو ملحدین سے مراد یہی طبقہ ہوتا ہے۔

لاادریت(Agnosticism)

عام معنوں میں اس سے مراد خدا کو اپنے ادراک (سوچ، سمجھ) سے ماوراء سمجھ کر اس معاملے میں سکوت کا رویہ اختیار کرنا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ خدا ہے یا نہیں، ہم اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہمیں اس بارے میں صرف یہ سوچنا چاہیے کہ "ہمیں معلوم نہیں ہے۔" ان لوگوں کو Agnostic Atheist کہا جاتا ہے۔ اس عقیدے کے ماننے والے لوگ خدا کے انکار و اقرار دونوں سے دور رہتے ہیں۔

ڈیزم (Deism)

یہ نظریہ خدا کو صرف ایک خالق کائنات کی حد تک ماننے کا اصرار کرتا ہے۔ اس نظریے کے قائل لوگوں کے مطابق خدا کائنات کو وجود میں لا کر اور اس کے لیے مقرر قوانین بنا کر خود کو معطل کر چکا ہے لہٰذا نظام کائنات میں اب کسی ہستی کی مداخلت نہیں ہے اور اس کائنات کا اب کوئی ناظم نہیں ہے۔ یہ عقیدہ ایسا ہی ہے کہ جیسے ایک شخص نے آٹو میٹک گھڑی بنا دی اور اب وہ گھڑی از خود چلتی رہتی ہے۔

موجودہ الحاد کی تاریخ

خدا کے انکار کا یہ رجحان نیا نہیں ہے بلکہ ماضی کے ادوار میں بھی ہمیں بعض لوگوں کے ہاں یہ خیال ملتا ہے، زمانۂ قدیم سے ہی بعض لوگ کسی نہ کسی درجے پہ الحاد کے قائل تھے لیکن اس معاملے میں خدا کے وجود کا مطلق انکار بہت ہی کم کیا گیا۔ بڑے مذاہب میں بدھ مت کے ہاں خدا کا کوئی واضح تصور نہیں پایا جاتا، تاہم دیوتاؤں پر بدھ مذہب کے ماننے والے بھی یقین رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا بھر میں صرف چند فلسفی ہی ایسے گزرے ہیں جنھوں نے خدا کا انکار کیا۔ بعض نے اسے مختلف صورتوں میں تسلیم کیا ہے لیکن اس کی حیثیت صرف خالق کی مانی ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی میں خدا پر عدم یقین کا رجحان محض ذاتی خیال پر مبنی تھا اس میں سائنسی و تکنیکی وجوہات شامل نہ تھی، لیکن جدید دور میں اس طرزِ فکر نے ایک منظم حیثیت حاصل کر لی ہے اور موجودہ الحاد سائنس اور علمیات (Epistomology) پر مبنی ہے۔

الحاد کو حقیقی فروغ موجودہ زمانے ہی میں حاصل ہوا جب دنیا کی غالب اقوام مثلاً یورپ و امریکہ نے اسے اپنے نظام حیات کے طور پر قبول کر لیا اور اپنے تمام معاملات سے مذہب کو بے دخل کر دیا۔ موجودہ الحاد کی تحریک کی تاریخ ہم سولھویں صدی کے اختتام سے شروع کر سکتے ہیں۔ یورپ میں قرون وسطی میں کلیسا کے مظالم کے خلاف تحریکیں اٹھیں اور عیسائیت میں ایک نئے فرقے پروٹسٹنٹ کا ظہور ہوا۔ ان دونوں فرقوں میں کئی بار باہمی خانہ جنگی ہوئی۔ جب

کوئی پروٹسٹنٹ حکمران ہوتا تو وہ کیتھولک پر مظالم کرتا اور جب حکمران کیتھولک ہوتا تو پروٹسٹنٹ پر مظالم کرتا۔ یہ صورت حال عوام کے لیے مذہب سے بیزاری کا ایک اہم سبب بنی۔

اس کے ساتھ ہی اس دور میں یورپ میں نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کا عمل شروع ہوا اور تعلیم تیزی سے پھیلنے لگی۔ اُس وقت مذہبی رہنماؤں کی جانب سے سائنس کی نئی دریافتوں بالخصوص کائنات کے متعلق ان سائنس دانوں کے پیش کردہ نظریات کے متعلق متشددانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ گلیلیو کو اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ اعلان کرے کہ سورج زمین کے گرد گردش کرتا ہے۔ اطالوی فلسفی اور ماہر طبعیات جیور دانو برونو (1548-1600CE) پر بھی الحاد کے الزام میں مذہبی عدالت کی طرف سے مقدمہ چلایا گیا کچھ عرصے کی قید بامشقت کے بعد معافی مانگنے سے انکار پر اسے زندہ جلا دیا گیا۔ اسی طرح دیگر ماہرین فلکیات اور طبعیات کو بائبل کے خلاف ان کے سائنسی نظریات کی بناء پر سزائے موت دی گئیں جن میں نکولس کوپرنیکس (1473-1543CE) جیور جیس اگریکولا (1494-1555) جیسے جید سائنس دان شامل تھے۔

سائنسی علوم کے علمبرداروں نے جب عیسائیت کو منطق اور عقلی میزان پر جانچنا چاہا اور عیسائیت کے بعض عقائد پر تنقید کی تو یہ بات مذہبی طبقے کی جانب سے برداشت نہ کی گئی۔ اس معاملے میں عیسائیت سے وابستہ یہ دونوں ہی فرقے شدت پسند تھے، مذہبی انتہاء پسندی اس حد تک پہنچ گئی کہ کوئی بھی شخص جو مذہبی عقائد سے ذرا سا اختلاف بھی کرتا تو اسے مرتد قرار دے کر قتل کر دیا جاتا۔ پروٹسٹنٹ نے اگرچہ عیسائیت کو پوپ کی غلامی سے آزاد اور کئی مذہبی اصلاحات نافذ کرکے عیسائیت کو روشن خیالی کی طرف گامزن کیا تھا لیکن اس بات پر وہ بھی تحمل نہ کر سکتے تھے کہ بائبل کے بیانات کو کوئی عالم عقلی طور پر غلط ثابت کر دے۔ کئی سائنسدانوں کو بائبل کے خلاف ان کے علمی نظریات کی بناء پر سزائے موت دی گئی۔ ان سائنس دانوں پر مذہبی رہنماؤں

کے تشدد اور عیسائیت میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کی باہمی خون ریزی کے نتیجے میں ناگزیر طور پر مذہب اور خدا کے متعلق بھی بہت سے لوگوں کی فکر متاثر ہوئی۔

کئی لوگ اس صورتحال کی وجہ سے مذہب سے بیزار ہو رہے تھے اور مذہب پر کھلی تنقید کر رہے تھے۔ اس تنقید میں سب سے زیادہ حصہ اُس دور کے فلسفیوں نے لیا۔ ڈیکارٹ Descartes (1596–1650) جو جدید فلسفہ کا بانی سمجھا جاتا ہے پہلا شخص تھا جس نے فلسفہ اور مذہب میں تفریق پیدا کی۔ اگرچہ وہ خدا کا قائل تھا لیکن وہ عقل پرستی کو فروغ دینے کا زبردست حامی تھا۔ اٹھارہویں صدی میں مشہور امریکی فلسفی ٹامس پائین (1737-1809) نے اپنی کتاب The Age of Reason شائع کی جس میں انھوں نے اپنے خیال کے مطابق عیسائیت کی خرابیوں اور بائبل کی غیر منطقی باتوں کو واضح کرتے ہوئے ان پر شدید تنقید کی۔ اس کے بعد ملحد فلسفیوں کی جانب سے مذہب پر تنقید کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس ضمن میں مشہور فلسفی کانتے (1798-1857) نے ایک خاص فلسفہ پیش کیا جو کہ "پازیٹو ازم (Positivism)" کہلاتا ہے۔ اس کی رو سے صرف ان چیزوں کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے جو قابل مشاہدہ اور قابل ثبوت ہیں اور بقیہ چیزوں کے وجود کو مسترد کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالی کی ذات قابل مشاہدہ نہیں، اس وجہ سے اس کا انکار کر دیا گیا۔ کانتے کا یہ فلسفہ دورِ جدید کے الحادی نظام کی اہم بنیاد بنی۔ مذہبی علماء اور سائنس دانوں کی یہ خانہ جنگی مذہب اور سائنس کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج پیدا کر رہی تھی۔ اس تشدد کی وجہ سے عقل پسند طبقے کے لیے مذہب اور اس سے وابستہ تمام امور قابل نفرت ہو چکے تھے۔ مذہب کے غیر ضروری عقائد، نفس کشی، عبادات اور دیگر تمام حدود سے وہ تنگ آ کر باہر آنے لگے۔

ب تک اہل مذہب یہ دلیل پیش کرتے آئے تھے کہ کائنات کا وجود ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ
س کا کوئی خالق موجود ہے لیکن انیسوی صدی میں چارلس ڈارون (1809–1882) نے
نظریہ ارتقاء پیش کیا۔ اس نظریے سے ملحد سائنس دانوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بے جان مخلوق
سے خود بخود ایک جاندار خلیہ پیدا ہوا جو کہ لاکھوں سالوں میں ارتقاکے عمل سے گزر کر ابتدائی
درجے کا جانور بنا اور پھر کروڑوں سالوں میں آہستہ آہستہ یہ مختلف جانوروں کی صورت اختیار کرتا
ہوا انسان بن گیا۔ اس کے بعد ملحد لوگ علی الاعلان مذہب سے بیزاری کا اظہار کرنے لگے اور
بہت سے سائنس دان و فلسفی خدا کی مختلف توجیہات پیش کرنے لگے۔

اسی دوران Deism کی تحریک بھی پیدا ہوئی۔ اس کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ اگرچہ خدا ہی نے
اس کائنات کو تخلیق کیا ہے لیکن اس کے بعد وہ اس سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ اب یہ کائنات خود
بخود ہی چل رہی ہے اس تحریک کو فروغ ڈیوڈ ہیوم اور مڈلٹن کے علاوہ مشہور ماہر معاشیات ایڈم
سمتھ (1723–1790) کی تحریروں سے بھی ملا۔ ان لوگوں نے بھی چرچ پر اپنی تنقید جاری
رکھی اور چرچ کا جبر و تشدد جاری رہا۔ تقریباً دو سو سال تک یہ تحریک بھی مختلف شکلوں موجود رہی
اور مذہب و سائنس کے درمیان جنگ جاری رہی۔ انیسویں صدی میں کارل مارکس (1818–
1883) نے اشتراکیت کا نظام پیش کیا۔ اگرچہ یہ نظام معاش سے متعلق تھا لیکن اس کی بنیاد اس
تصور پر تھی کہ مذہب عوام کے استحصال کے لیے گھڑا گیا ہے۔ دیگر فلسفیوں کی طرح مارکس نے
بھی مذہب پر کئی واضح تنقیدیں کیں لیکن ان کی تنقید کا محور بالخصوص یونانی فلسفی اور ان کا مذہب
تھا۔ سائنس اور مذہب کے مابین اس جنگ میں سائنس کی جیت ہوئی اور علمی ترقی سے لوگوں پر
یہ بالکل واضح ہو گیا کہ زمین کی پیدائش، نظام شمسی اور زمین کی ہیت کے بارے میں اہل مذہب
کی آراء کس قدر غیر معقول ہیں، اس فکر کے رد عمل میں کلیسا کی طرف سے جو انتہائی درجے کا جبر
و تشدد کا اختیار کیا گیا۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ اٹھارہویں صدی میں یورپ کے اہل علم طبقے میں

بالعموم انکار خدا کی لہر چل نکلی جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل تک اپنے عروج پر پہنچ گئی۔

بیسویں صدی کی سائنسی تحقیقات کی الحاد پر ضرب

انیسویں صدی کے آخر تک الحاد مغرب میں اپنی مضبوط جڑیں پکڑ چکا تھا۔ اس دور میں وہ سائنسی تحقیقات ہوئیں جنھوں نے الحادی نظریات کی توجیہ پیش کی سیکولرازم سمیت الحاد اور اس سے متعلقہ نظام ہائے حیات کو دنیا بھر میں فروغ ملا۔ مذہب کے نام پر ہونے والی جنگیں عوام کے ذہنوں پر مذہب کی انتہائی غلط تصویر پیش کر چکی تھیں۔ مختلف فلاسفرز اور سائنس دانوں کے پیش کردہ نظریات کی بناء پر مذہب کی بنیادیں بظاہر کمزور نظر آرہی تھیں حتیٰ کہ یہ دعویٰ کیا جانے لگا کہ اب انسانیت کو کسی "خدا" اور "مذہب" کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس کے سبھی مسائل کا حل اس کی عقل دے سکتی ہے۔ اس دور میں ہونے والی ترقی کے سبب بظاہر یہ دعویٰ درست نظر آرہا تھا لیکن بیسویں صدی کے ہی نصف میں کئی ایسے علمی انکشافات ہوئے جنھوں نے وہ اکثر بنیادیں منہدم کر دیں جن پر ملحدین کے افکار قائم تھے۔

ملحدین یہ خیال کرتے تھے کہ کائنات ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ لیکن اسی صدی میں بگ بینگ تھیوری نے اس نظریے کو غلط ثابت کر دیا۔ اس تھیوری کے مطابق کائنات توانائی کے ایک بہت بڑے گولے کی شکل میں موجود تھی جو ایک بہت عظیم دھماکے (Big Bang) کے نتیجے میں مادے کی صورت اختیار کر گیا۔ اس نظریے کو ماننے کا مطلب یہ تھا کہ یہ مان لیا جائے کہ کائنات کا کوئی خالق ہے۔ لہٰذا ابتداء میں ملحد سائنس دان اور مفکرین نے اس نظریے کو ماننے سے انکار کر دیا لیکن مزید سائنسی تحقیقات

نے اس نظریے کو اس قدر تقویت دی کہ اسے ٹھکرانا ناممکن ہو گیا۔ وہ قدیم نظریات جو الحاد ن بنیاد بن چکے تھے، رفتہ رفتہ سائنسی ترقی اور کائنات کے متعلق نئے انکشافات کی وجہ سے رد ہو رہے تھے۔ اس صورتحال کی وجہ سے بالعموم عقل پسند سائنس دانوں میں خدا کو ماننے کی تحریک شروع ہوئی اور کئی بڑے سائنس دان اور فلسفیوں نے خدا کے وجود کو منطقی بنیادوں پر تسلیم کیا۔ کائنات کی ملحدانہ تعبیر کو سائنسی غلطی تسلیم کر لیا گیا لیکن اس کے باوجود ایک بڑی تعداد نے جو خدا کو ماننے کو تیار نہ تھی ڈیزم کو اختیار کیا۔ حتیٰ کہ اب بعض مفکرین جو خود کو کٹر ملحد ثابت کرتے ہیں، کسی نہ کسی سطح پر ڈیزم کی پناہ ضرور لیتے ہیں۔

اقوام عالم پر الحاد کے اثرات

اقوام عالم پر جب مغرب کا غلبہ ہوا تو دوسرے ممالک میں مغرب کی صنعتی اور سائنسی ترقی کے ساتھ یہ نظریہ بھی پہنچا۔ یورپ میں یہودیت اور عیسائیت ہی اس طوفان کی زد میں آئی تھی، جبکہ یورپ سے باہر ایک ہی خطے میں مختلف مذاہب کے ماننے والے موجود تھے جن پر الحاد کی تحریک کا اثر مختلف انداز میں ہوا۔ مناسب ہوگا کہ بجائے علاقے کے مذہبی اعتبار سے یہ جائزہ لیں کہ کس قوم پر الحاد کا اثر کس طرح ہوا ہے۔

ہندو

ہندو حضرات عام طور پر روایت پسند اور فطری طور پر مذہب پسند واقع ہوئے ہیں ۔ہندومت نے اپنے پیروکاروں کے ذہن کو صدیوں سے مطمئن کر رکھا تھا۔ اسلاف پرستی کا شدید جذبہ اور مذہبی عقائد کی بے جا آزادی کا تصور پہلے ہی موجود تھا اس لیے اس مذہب کو الحاد سے زیادہ خطرہ نہ تھا۔ ایک شخص خدا کا انکار کر کے بھی ہندو رہ سکتا تھا۔ ان کے ہاں کئی ناستک فرقے بھی خدا کے منکر تھے لیکن اس کے باوجود مذہبی کتاب، شخصیات، رسوم اور دیوتاؤں پر پختہ یقین کی وجہ سے ہندوؤں نے بھی الحاد کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔

ہزاروں برس سے چلتی ہوئی ہندوؤں کی تہذیب خالصتاً مذہب پر استوار ہے، لوگ چاہے مذہب اور خدا کی کتنی ہی گستاخی کریں، خود کو ہندو کہلوانے پر فخر محسوس کرتے ہیں اور اپنی مذہبی شخصیات سے عقیدت رکھتے ہیں۔ عقلیت پسندی کی شدت نہ ہونے اور تہذیب و تمدن میں مذہب کے گہرے اثرات نے الحاد کو یہاں کبھی پنپنے کا موقع نہیں دیا۔ مغرب کی طرح

خدا کے انکار مطلق اور مذہب بیزاری کی عمومی فضا پیدا نہیں ہو سکی اور لوگ خود کو مذہب سے کبھی دور نہیں لے گئے۔ البتہ ایک قابلِ لحاظ تعداد لبرل ازم کی طرف مائل ہوئی۔ ہندومت کو الحاد سے خطرہ نہ ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس مذہب میں اس قدر آزادی ہے کہ ایک شخص ملحد ہو کر بھی ہندو رہ سکتا تھا۔

بدھ مت اور دیگر مشرقی ایشیائی مذاہب

جنوبی ایشیاء سے آگے ہی مذاہب کی ایک اور بڑی روایت ایسی رہی ہے جس کا تعلق خاص مشرقی ایشیائی تہذیب سے رہا ہے۔ ان میں کنفیوشس ازم، بدھ مت اور تاؤ ازم شامل ہے۔ ان سبھی مذاہب میں، جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ خدا کے بارے میں کوئی واضح تصور موجود نہیں ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مذاہب پہلے ہی کسی حد تک الحاد کے ہم فکر نام تھے۔ ان کے مذہب کا اثر پہلے ہی ان کی زندگی پر انتہائی سطحی طور پر تھا، خدا کا تصور بھی غیر واضح تھا اس لیے انھیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑا کہ گوتم بدھ، کنفیوشس اور تاؤ کو ایک قومی ہیرو تسلیم کر کے خود کا برملا ملحد کہہ دیا جائے۔ جدید دور میں سب سے زیادہ تعداد جو الحاد بالخصوص ڈیزم اور اگنوسٹک ازم کی طرف مائل ہوئی وہ انھی سے تعلق رکھتی ہے بالخصوص چین اور جاپان کی آبادی کا بیشتر حصہ خود کو بدھ مت، کنفیوشسزم اور طاؤازم سے منسوب کرتے ہوئے اگنوسٹک کہتا ہے۔

مسلم

دنیا بھر میں الحاد کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ ہمیشہ سے ہی اسلام رہی ہے۔ مذہب اسلام کی سادگی اور عقلی بنیادوں کی وجہ سے اسلام کو ضرب پہنچانے کا خاص موقع بھی نہیں مل سکا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مذہب بیزاری کے جو اسباب قرون وسطیٰ

میں عیسائیت میں تھے، اسلام میں ایسی کوئی بات موجود نہیں تھی۔ کلیساء کے یونانی نظریات کو سائنس نے باطل ثابت کر کے عیسائیت سے اعتماد اٹھا دیا تھا۔ لیکن اسلام میں چونکہ اس قسم کے کوئی عقائد نہیں تھے جس کی مخالفت سائنس کرے، لہٰذا اسلام اس قسم کے حملوں سے محفوظ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی الحاد کو مغرب میں جہاں عیسائیت اور یہودیت کا رواج تھا، بہت سے پیروکار مل گئے لیکن مسلمانوں میں بہت کم پیروکار مل سکے۔ مسلمانوں میں الحاد کو جن لوگوں نے تسلیم کیا ہے ان میں زیادہ تر کا تعلق ایسے مغربی ممالک سے ہے جن کی اسلامی علوم تک رسائی مشکل رہی ہے اور ان میں سے اکثر کا تعلق کمیونسٹ پارٹیوں سے رہا ہے۔ تاہم مسلمانوں کا وہ اشرافیہ طبقہ جن کا مغرب سے تعامل رہا تھا، وہ لبرل ازم کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔

انقلابِ فرانس کے بعد سیکولر ازم اور کمیونزم نے ملحدوں کی تعداد لاکھوں سے کروڑوں تک پہنچادی تھی۔ لیکن اس کامیابی کے بعد بھی الحاد کا زور ابھی تک مخصوص خطوں میں تھا۔ مغربی خطے سے باہر صرف چین الحاد کی لپیٹ میں آیا کیونکہ یہاں کمیونزم کو بطور نظام حیات اپنا لیا گیا تھا، نیز ان کا مذہب بھی الحاد سے کسی حد تک قریب ہی تھا۔ جبکہ باقی دنیا میں اور خصوصاً مسلم دنیا میں اس کے اثرات نہ ہونے کے برابر رہے۔

الحاد، جدید دور میں

حالیہ دور میں بڑھنے والی مذہبی انتہاء پسندی اور لامحدود آزادی کے تصور کی وجہ سے دین کی مخالفت کے جذبات نے مغرب میں کافی شدت اختیار کرلی ہے۔ چونکہ سائنس کے نام پر قائم کی گئیں الحاد کی کئی فکری بنیادیں خود سائنس نے باطل ثابت کردی تھیں، اس لیے اب خدا کے انکارِ مطلق کی کوئی گنجائش نہیں رہی، لیکن مذہب سے ملحدین کی مخاصمت باقی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں کٹر الحاد کے مقابلے میں اگنوسٹک ازم اور ڈیزم کو زیادہ فروغ ملا۔

نیو اتھیزم

الحاد کے لیے دورِ جدید میں ایک نئی اصطلاح New Atheism بھی رائج العام ہے۔ اپنے مقصود و منشاء کے اعتبار سے یہ الحاد کی کوئی شاخ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ علمی تحریک ہے جو بیسوی صدی میں مذہب کی مخالفت کے لیے بعض مغربی مصنفین نے شروع کی۔ ان مصنفین میں سے اکثر کا تعلق عیسائیت سے تھا لیکن وہ بعد میں الحاد کی طرف مائل ہوئے۔

دیگر ملحد مصنفین کے برعکس جنہوں نے تشکیک کو فروغ دیا، یہ مصنفین (New Atheist Writers) خاص طور پر مذہب کے متعلق مخالفانہ مزاج رکھتے ہیں جس کا مشاہدہ ان کی کتابوں میں کیا جاسکتا ہے۔ ان مصنفین میں رچرڈ ڈاکنز (b-1941)، ڈینیل ڈینٹ (b-1942) سیم ہیرس (b-1967) اور کرسٹوفر ہچنز (b-1949) شامل ہیں جن

کتابیں عالمی سطح پر کافی مشہور مقبول ہوئیں ہیں۔ اس کے علاوہ یہ مفکرین اپنے نقطۂ نظر کے فروغ کے لیے مختلف سیمینارز اور کانفرنسز بھی منعقد کرتے رہتے ہیں جس کی بدولت ان کے نقطۂ نظر کی عالمی سطح پر تشہیر جاری ہے۔

نیو اتھیزم تحریک میں خاص طور پر قابل ذکر نام رچرڈ ڈاکنز کا ہے جو کہ ایک سائنس دان ماہر حیاتیات بھی ہیں۔ مذہب و خدا کی شدت سے مخالف کے باوجود ان کا کہنا ہے کہ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ "خدا کا وجود نہیں ہے"۔[1] رچرڈ ڈاکنز نے مسلم اور عیسائی علماء و محققین سے مناظرے بھی کیے ہیں جن میں روون ولیم (b-1950)اور حمزہ اینڈریاس((b- 1980 کے ساتھ ان کے مناظرے مشہور اور قابل دید ہیں۔

اس تحریک میں مذہب کے متعلق تنقید کا ہدف عقیدۂ آخرت، فرشتے، معجزات اور وہی امور تھے جس کے متعلق ماضی میں بھی بعض ملحدین اعتراضات اٹھاتے رہے تھے۔

---

[1]http://www-dailymail-co-uk/news/article-2105834/Career-atheist-Richard-Dawkins-admits-fact-agnostic-html (11 Aug 2013)

ملحدین کے افکار

مذہب

مذہب کے انکار میں ملحدین کا نقطۂ نظر ہے کہ مذہب دراصل قدیم انسانوں کی ایجاد ہے جسے انھوں نے اپنے فہم سے بالاتر سوالوں کے جواب نہ ہونے پر ذہنی تسکین کے لیے وضع کر لیا تھا۔ لیکن اب سائنس کی ترقی نے انسان کو وہ سب کچھ بتادیا ہے جس سے وہ پہلے لاعلم تھا۔ مثلاً گزشتہ زمانوں کے لوگوں نے جب سورج کو ایک مخصوص وقت پر طلوع ہوتے اور غروب ہوتے دیکھا تو ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اس کے پس پردہ ایک عظیم الشان اور مافوق الفطرت ہستی کے وجود کو تسلیم کر لیں۔ اسی طرح دیگر بہت سے سوالات جس کی بابت ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا اس کے متعلق انھوں نے یہ عقیدہ گھڑ لیا کہ یہ اسی غیبی ہستی کا کارنامہ ہے۔ لیکن چونکہ اب ہم اس دور میں جی رہے ہیں جہاں ہمیں ان سب کے فطری اسباب معلوم ہو چکے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ سورج کا نکلنا اور ڈوبنا زمین کے گرد گھومنے کی وجہ سے ہوتا ہے، لہٰذا ہمیں اس کا کریڈٹ کسی خدا یا دیوتا کو دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح کائنات کے دیگر فطری عوامل کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے بھی خدا کے بجائے اس کی توجیہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔

عقیدۂ آخرت کے بارے میں ملحدین کا موقف ہے کہ موت واقع ہو جانے کے بعد انسان کا تعلق اس دنیا سے ختم ہو جاتا ہے اور پھر وہ کبھی لوٹ کے نہیں آتا۔ مرنے سے پہلے ہم موت کے بعد کیا ہوتا، اور کچھ ہوتا بھی ہے یا نہیں اس کا مشاہدہ نہیں کر سکتے اس لیے عقیدۂ آخرت کو تسلیم کرنا

غیر ضروری ہے۔ان کے نزدیک چونکہ مذہبی عقائد کی کوئی ٹھوس قابل مشاہدہ دلیل نہیں ہوتی لہٰذا اسے اب ایک گزرے ہوئے زمانے کا قصہ سمجھ کر بھول جانا چاہیے اور مذہبی عقائد کو تسلیم کرنا انسانی عقل کی شان کے خلاف ہے کیونکہ جن سوالات اور مسائل کے لیے خدا اور مذہب کا وجود تھا اب ہمارے پاس ان کے خالص ٹیکنیکل اور منطقی جوابات موجود ہیں۔ان ملحد فلاسفہ کا اصرار ہے کہ ایک عقل پسند شخص ایسی کسی بات پر ایمان نہ لائے جس کا مشاہدہ حواس خمسہ سے نہ ہو۔

نفسِ انسانی کے متعلق ملحدین کا نقطۂ نظر

اہل مذہب نفس انسانی سے متعلق امور کو روح سے جوڑتے ہیں، چونکہ روح کا کوئی مادی وجود نہیں ہے لہٰذا ملحدین روح کو نہیں مانتے۔ ملحدین کے نزدیک انسان کے نفس میں جو کچھ اس کی تمنائیں، جذبات، عقل وغیرہ سبھی صرف خلیوں (Cells) کے نظام اور خارجی دنیا کے ساتھ انسانی جسم کے تعلق کا نتیجہ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے دو پتھروں کو باہم رگڑنے سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔

طرزِ حیات

خدا کے وجود کے انکار کے ساتھ ہی لازمی نتیجہ کے طور پر وحی اور آسمانی صحائف کی بھی کوئی حقیقت واہمیت ملحدین کے نزدیک باقی نہیں رہتی۔ اہل مذہب کے مطابق خدا تعالیٰ نے زندگی گزارنے کے لیے وحی نازل فرمائی تاکہ انسان ان احکامات کے مطابق اپنی زندگی گزارے۔ لیکن جب مذہب کا انکار کیا جارہا ہو تو پھر طرزِ حیات کے متعلق سوچ و فکر میں بھی

تبدیلیاں آتی ہیں۔ ملحدین طرزِ حیات کے متعلق عام طور پر سیکولرزم اور معاشیات میں سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت کے قائل ہیں۔

مطلق آزادی کا تصور

فرد کی بے لگام آزادی ملحد نظامِ فکر کا بنیادی خاصہ ہے۔ یعنی ایک فرد اپنی انفرادی زندگی میں ہر طرح سے مکمل آزاد ہونا چاہیے اور اپنی داخلی اور خارجی زندگی میں بھی اس سے مذہب کا ظہور نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ مذہب جو سماجی اصول وضوابط، عبادات اور اقدار کا جو ضابطہ فراہم کرتا ہے، ملحدین کے نزدیک یہ سب غیر ضروری اور عملی زندگی میں غیر حقیقی ہیں۔ چنانچہ انسان کو اپنی زندگی میں مذہبی قدغن مثلاً شراب نوشی، زنا، سود، برہنگی وغیرہ کی حرمت کا احترام اور ان کی پابندی نہیں کرنی چاہیے۔ اس مطلق آزادی کے تصور میں مذہب محض ایک ثقافتی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی ایک شخص جس مذہب و سماج میں پیدا ہوگا، اس کی شادی بیاہ، تہوار، تجہیز و تدفین وغیرہ کے رسوم اسی مذہب کے مطابق ہوسکتے ہیں۔

معاشی نظام

معاشی نظام کے متعلق ملحدین دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ سرمایہ دارانہ نظام کا قائل ہے جس کی بنیاد سود ہے۔ جب کہ دوسرا گروہ اشتراکیت کا قائل ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کا اصرار ہے کہ ہر انسان کو تجارتی وصنعتی سرگرمیوں کے لیے قطعی آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ منافع کمانے کے لیے جو طریقہ مناسب سمجھے اختیار کرلے، منافع کے حصول کے لیے مذہبی قوانین کے تحت حلال و حرام کی کوئی تفریق نہیں ہونی چاہیے۔ نیز اس معاشی نظام میں سود، بیمہ، انٹرسٹ وغیرہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

اس کے برعکس اشتراکی نظام میں کوئی بھی کاروبار شخص کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ قومی ملکیت ہوتی ہے اور سبھی افراد حکومت کے ملازم ہوتے ہیں۔ اشتراکیت کی مختلف صورتیں موجودہ دور میں رائج ہیں۔

اباحیت اور جنسی آزادی

الحاد کے فروغ کے ساتھ ہی مغرب میں جنسی آزادی کا تصور بیدار ہوا۔ اکثر ملحدین کے مطابق کھانے پینے سونے کی طرح جنسی خواہشات کی تکمیل انسان کی فطری خواہش ہے اور لہٰذا اسے اجازت ہونی چاہیے کہ وہ جس طرح چاہے اپنی جنسی خواہش پوری کرے۔ اسی وجہ سے ان کے نزدیک زنا بالجبر ایک غلط کام ہے مگر دونوں فریقین کی رضامندی سے ہونے والے جنسی تعلق میں کوئی برائی نہیں۔

فری سیکس کے تصور کو سب سے پہلے اہل مغرب میں مشہور ملحد ماہر نفسیات اور نیورولوجسٹ سگمنڈ فرائڈ (1856-1939) نے پیش کیا تھا۔ فرائڈ کے مطابق جس طرح انسان بھوک، پیاس وغیرہ جیسی خواہشات کو پورا نہ کرے تو بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے اسی طرح جنسی خواہش کی تکمیل نہ ہونے پر بھی انسان ذہنی مریض بن جاتا ہے۔ فرائڈ کے نظریے کو اہل مغرب نے بخوشی قبول کیا اور مصنفین، فلسفی، موسیقار، شعراء، ڈرامہ نگار اور فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے سبھی لوگوں نے اس تصور کے فروغ کے لیے اپنی اپنی کوششیں کیں۔ دور حاضر میں جب مغرب میں فلم انڈسٹری قائم ہوئی تو اس انڈسٹری نے بھی جنسی آزادی کے تصور کو پروان چڑھایا۔ ابتداء میں عمومی قسم کی فلموں کے ذریعے لوگوں کے جنسی جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی گئیں لیکن جلد ہی باقاعدہ طور پر اس مقصد کی تکمیل کے لیے پورنوگرافی (Pornography) پر مبنی فلم انڈسٹری قائم کی گئی جس کا اہم مقصد اباحیت اور ننگے

پن (Nudism) کا فروغ ہے۔اس انڈسٹری میں کام کرنے والوں کو مغرب میں عصمت فروشوں کی حیثیت سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ یہ محض ایک فلمی پیشے کی حیثیت رکھتا ہے۔

ماضی میں خواتین میں فری سیکس تحریک کے فروغ میں ایک اہم رکاوٹ جنسی تعلق سے حاملہ ہونے کا خوف تھا لیکن مانع حمل ادویات کی ایجاد نے اس تصور سے متاثر خواتین کو اس میدان میں آگے بڑھنے کا موقع دیا کہ وہ شادی کے بغیر جنسی تعلق سے بھی حاملہ نہ ہوں۔ بعد ازاں مغرب میں آزادانہ جنسی تعلق کو قانونی حیثیت حاصل ہوگئی۔ جس کے مطابق زنا بالجبر کے علاوہ انسان جس طرح جس سے چاہے اپنی جنسی خواہش پوری کر سکتا ہے، اگر وہ ہم جنس پرستی کرے تو اس پر کوئی تنقید نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اس کا حق ہے۔ بیسویں صدی میں انٹرنیٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی بدولت اہل مشرق بھی اس جنسی بے راہ روی سے شدید متاثر ہوئے جس کا نتیجہ آج ہم بخوبی دیکھ رہے ہیں۔

اصول و مبادی

چونکہ ہم پوری کتاب میں خدا کے اثبات پر علمی گفتگو کریں گے اس لیے آغاز میں علمیات کے کچھ بنیادی اصول و مبادی کا فہم حاصل کرنا ضروری ہے۔ ان بنیادی اصول و مبادی کو سمجھ لینے سے نہ صرف ہمیں استدلال کا طریقہ کار معلوم ہو گا بلکہ کئی ایسے مغالطوں سے بھی واقفیت حاصل ہو گی جس پر الحادی نظامِ فکر استوار ہے۔ اس ابتدائی حصے میں ہم بنیادی اصول و مبادی مختصراً" مثالوں کے ساتھ بیان کر رہے ہیں جس کی تفصیل مولانا اشرف علی تھانوی ؒ کی کتاب الانتباہ المفیدۃ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ماورائے فہم اور خلاف عقل

عقلیات کے باب کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہی مرحلے میں ہم دو باتوں کے فرق کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ اوّل یہ کہ کوئی چیز ہماری فہم سے بلند ہو اور ہمیں سمجھ نہ آ سکے۔ دوم یہ کہ کسی چیز کے نہ ہونے، یا باطل ہونے کا ہمیں یقینی علم ہو جائے۔ عام طور پر لوگ ان دونوں کو آپس میں خلط ملط کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں جو ماورائے عقل ہو، وہ خلافِ عقل بھی ہو گا۔ یہ مفروضہ کئی قسم کے مغالطوں کا باعث بنتا ہے۔

چونکہ انسانی عقل ایک محدود مادی فریم اور اپنے موجود علم کے تناظر میں چیزوں کا ادراک کرتی ہے اس لیے یہ قطعاً ضروری نہیں ہے کہ جو چیز ہماری فہم میں نہ آئے، اس کا کوئی وجود نہیں ہو سکتا یا وہ خلافِ عقل ہی ہوں گی۔ آج کی جدید دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جس

کی حقیقت انسانی فہم پر واضح نہ ہونے کے باوجود اس پر یقین کیا جاتا ہے۔ جدید سائنس میں اس کی ایک مشہور مثال بلیک ہول (Black Hole) ہے۔

جدید سائنس کے مطابق جب کسی ستارے کی موت واقع ہوتی ہے تو ایک بلیک ہول بن جاتا ہے جہاں ٹائم اور اسپیس یعنی زمان و مکان کچھ نہیں ہوتا۔ بالعموم ہمارے لیے اس حالت کو سوچنا بھی محال ہے کہ وقت اور مکان (Time & Space) موجود نہ ہو۔ مگر جدید سائنس دانوں کے نزدیک یہ ماورائے فہم ہونے کے باوجود ایک انتہائی معقول بات ہے، سائنس میں ایسے کئی نظریات ہیں جنھیں ماورائے ادراک ہوتے ہوئے بھی حقیقت تسلیم کیا جاتا ہے۔

معیارِ قبولیت

کسی بھی دعوے یا مفروضے کو قبول کرنے کے لیے بنیادی طور پر دو اصول ہیں۔

- عقلاً ممکن ہو۔ یعنی اس کے نہ ہونے پر کوئی دلیل نہ ہو۔ نیز کسی عقلی لزوم کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً 2 = 1 + 1 ہونا لازم ہے اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔
- دلیل عقلی یا نقلی اثبات کے لیے کافی ہو۔

یہ دو اصول دراصل وہ کامن سینس ہے جس کا استعمال ہم زندگی کے بے شمار معاملات میں بھی کرتے ہیں۔ جو بات عقلاً ممکن ہو، محال نہ ہو اور کوئی قوی دلیل اس کا اثبات کر رہی ہو، مثلاً یہ بات گو کہ خلافِ مشاہدہ ہے مگر عقلاً ممکن ہے کہ انسان روشنی کی رفتار سے سفر کر سکے، اس میں کوئی خلافِ عقل بات نہیں ہے۔ چنانچہ ایسا عقیدہ یا دعویٰ اگر بیان کیا جاتا ہے تو اس کی دلیل کا جائزہ لیا جائے گا۔ اگر دلیل درست ہو تو خواہ ہمارے مشاہدے کے خلاف اور عقل سے ماورا ہو، اس پر یقین کیا جا سکتا ہے۔

یہی معاملہ ان حقائق کا بھی ہے جو مذہب بیان کرتا ہے۔ خدا کی ذات، پل صراط، جنت و دوزخ اور بہت سے معاملات یہی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ امور دراصل خلافِ عقل نہیں بلکہ عقل سے ماوراہیں۔ یعنی ان چیزوں کو عقل سے ثابت ضرور کیا جاسکتا ہے لیکن ان کی ہئیت کا ادراک مادی دنیامیں ناممکن ہونے کے سبب انہیں ماوراء عقل کہا جاتا ہے۔

غرض کہ مذہب کے بیشتر حقائق کو دلائل کی بنیاد پر ثابت کیا جاسکتا ہے، جس کی تفصیل متعلقہ مضامین میں آئے گی، سردست یہ سمجھنا ضروری ہے کہ جب کوئی امر عقلاً ممکن ہو، اور دعویٰ کے اثبات میں قوی عقلی یا نقلی دلیل ہو یعنی خبر کے ماخذ جب اپنی استناد اور صحت کے اعتبار سے ثابت ہو جائیں تو پھر ان پر ایمان رکھنا منطقی اعتبار سے لازم ہے۔

ذرائع علم

عام طور پر ہمارے پاس خارجی دنیا سے کسی بھی چیز کے بارے میں علم کے تین ذرائع ہوتے ہیں۔ مشاہدہ، عقلی استدلال اور خبر۔ ان تینوں کی تفصیل اس طرح ہے:

حواس خمسہ

علم کا سب سے پہلا اور بنیادی ماخذ ہمارے حواس خمسہ ہیں۔ کوئی بھی مادی چیز جب ان حواس کو متاثر کرتی ہے تو ہمیں اس کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ مثلاً اس بات کا علم ہم براہ راست اپنے مشاہدے (یعنی آنکھوں سے دیکھ کر) کر سکتے ہیں کہ سورج فی الواقع کوئی وجود رکھتا ہے۔ اسی طرح آگ، پانی، انسان، اور ہر ایک موجودات پر ہم ان حواس کی بدولت ہی یقین رکھتے ہیں۔ البتہ یہ جاننا ضروری ہے کہ بعض صورتوں میں ان حواس سے صحیح علم حاصل نہیں ہو پاتا، مثلاً ہماری کسی بیماری کی حالت میں لمس، بصارت اور دیگر حواس کی کارکردگی متاثر ہو سکتی ہے۔ لیکن عام حالات روزمرہ کی زندگی میں یہی حواس ہمارے لیے علم کا ماخذ ہوتے ہیں۔

عقلی استدلال

علم کا دوسرا اہم ذریعہ عقلی استدلال ہے جس میں ہم دلائل اور دستیاب علم (معلوم) کی بنیاد پر کوئی نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ اسے عام مثال سے یوں سمجھ لیجیے کہ جب ہم ساحل کی ریت پر کسی پاؤں کے نشان دیکھتے ہیں تو گو کوئی شخص ہمارے سامنے موجود نہ ہو، مگر ہم یقین کر لیتے ہیں کہ یہاں سے کوئی گزرا تھا۔ دھوپ دیکھ کر آپ سورج کا یقین کر لیتے

ہیں خواہ آپ سورج کو براہ راست نہ دیکھ رہے ہو۔ اسی طرح فرض کیجیے کہ آپ ایک کمرے میں ایک کتاب کہیں رکھ کر جاتے ہیں، اور کچھ وقت بعد جب واپس آکر دیکھتے ہیں تو کتاب کہیں اور رکھی ملتی ہے۔ آپ کا ذہن فوراً یہ نتیجہ اخذ کرلیتا ہے کہ اسے یقیناً کسی نے اٹھا کر یہاں رکھا ہوگا کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ کتاب خود سے اٹھ کر کہیں نہیں جاسکتی۔ عام طور پر بہت سے امور جنھیں ہم براہ راست حواس سے نہیں سمجھ پاتے، اس کے بارے میں ہم قیاس، غور و فکر اور استنباط سے علم حاصل کرتے ہیں۔ سائنس کے اکثر و بیشتر مسئلے اسی طرح معلوم کیے جاتے ہیں۔ مثلاً کشش ثقل کوئی مادی شے نہیں ہے جسے کوئی شخص آپ کے سامنے کھڑا کر سکے۔ لیکن اس کے اثرات اس قدر واضح اور حقیقی ہیں کہ اس کا انکار کسی صورت ممکن نہیں ہے۔Energy یعنی قوت کو حواس خمسہ کی گرفت میں نہیں لایا جاسکتا۔اسی طرح اب سائنس بھی انرجی، اضافت، اور ڈیومیکانکس (Wave Mechanics) جیسے بے شمار ناقابل مشاہدہ امور اور نظریات ہیں جو اسی طرح استنباط کی بنیاد پر قائم کیے گئے ہیں۔

خبر

علم کا تیسرا ذریعہ ایسی خبر ہے جس کی استنادی حیثیت مشکوک نہ ہو۔ یہ ذریعہ گو علمیات (Epistemology) میں بنیادی حیثیت کا حامل نہیں ہے جس کی تفصیلی بحث فلسفے کی کتب میں Epistemology of Testimony میں دیکھی جاسکتی ہے تاہم سر دست یہ بتانا مقصود ہے کہ بعض شرائط کے ساتھ جدید فلاسفرز کی اکثریت نے بھی اسے علم کے ماخذ میں شامل کیا ہے۔ خبر یا شہادت کی بنیاد پر معلومات لینے کا کام ہم عام زندگی میں بہت زیادہ کرتے ہیں۔ مثلاً عام لوگوں میں کسی نے نہیں دیکھا کہ خلیہ، فضا میں موجود گیس، بیماریاں، جراثیم، بیکٹیریا وغیرہ کیا ہیں، لیکن ہم سائنس دانوں اور ماہرین پر اعتماد کرتے

ہوئے ان پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم میں سے کسی نے بسر چشم نہیں دیکھا کہ زمین فی الواقع گول ہے، مگر ہم اس بات کو مانتے ہیں۔ آئین اسٹائن کی گواہی سے ہم بلیک ہول کے وجود کو بن دیکھے مان سکتے ہیں۔ اسی طرح جب ہم ایک ڈاکٹر کے پاس بھی جاتے ہیں جو ہمیں ہمارے مرض کے بارے میں بتاتا ہے تو ہم اس پر یقین رکھتے ہیں اِلّا یہ کہ اس کی قابلیت ہمارے سامنے مشکوک ہو جائے۔ ایسی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں جس میں ہم دوسروں کے علم اور ان کی اطلاع پر اعتماد کرتے ہیں بشرطیکہ ہمارے پاس اس کے خلاف کوئی دلیل نہ ہو۔ مثلاً ہمیں کوئی یہ کہہ دے کہ کل رات تمہیں فلاں شخص نے زخمی کر دیا، حالانکہ ہم جانتے ہوں کہ ہمیں کسی نے زخمی نہیں کیا تو ایسی خبر پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔

الغرض کسی چیز کے ہونے یا نہ ہونے کو ماننے کے لیے ہمارے پاس تین ذرائع ہیں۔ حس و مشاہدہ، استدلال اور خبر صادق۔ کوئی بات ان میں سے کسی ایک سے بھی ثابت ہو جائے تو اس کے لیے دوسرے ذرائع سے دلیل مانگنا غیر معقول رویہ ہے۔ کسی چیز کو ماننے کے لیے اصل بات یہی ہے کہ وہ ان تین ذرائع میں سے ایک سے ثابت ہو جائے۔

ثبوت اور نظیر

ایک عمومی مغالطہ بعض اذہان میں یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی واقعے کی صداقت تسلیم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی نظیر موجود ہو۔ مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے یہ معجزہ ظاہر ہوا کہ سمندر درمیان میں سے کھل کر راستہ بن گیا تو اکثر لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟ کیونکہ ایسا عمومی طور پر کبھی نہیں ہوا۔ مگر جیسا کہ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں کہ اگر کوئی واقعہ محال نہ ہو، ممکن ہو تو پھر اس کی صداقت جانچ کر یقین کیا جاسکتا ہے خواہ اس کی کوئی نظیر موجود نہ ہو۔ کسی بھی فلسفہ و منطق

ن یہ اصول کبھی بھی وضع نہیں کیا گیا کہ جس چیز کی مثال ہم نے نا دیکھی ہو، یا جو بھی چیز ماری قدرت سے باہر ہو، وہ ناممکن ہے۔ بلکہ اصول یہ ہے کہ جب تک کسی چیز کے محال ونے پر قطعی دلیل نہ ہو، وہ ممکن رہتی ہے، بلکہ خبر کا ذریعہ (Source of Information) درست ہو۔

ضروری نہیں کہ وہی واقعہ سچ ہو جو پہلے بھی ہو چکا ہو، اگر یہ معیار مان لیا جائے تو پھر یہ عجیب صول بن جاتا ہے کہ کسی بھی واقعے کے سچے ہونے کے لیے ضروری ہو گا کہ وہ واقعہ دو مرتبہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ اصول بالکل ہی غیر منطقی ہے۔ چنگیز خان کے قتل عام کے ثبوت کے لیے ضروری نہیں ہے کہ اس دور میں بھی کوئی چنگیز خان سامنے موجود ہو۔ اسی طرح بہت سے واقعے ایک ہی مرتبہ وقوع پذیر ہوتے ہیں، اس کی صداقت کے لیے اسے بار بار ہونا ضروری نہیں۔ چنانچہ کوئی دعویٰ سامنے آتا ہے تو امکان، عقل، خبر ان تینوں ذرائع کو ہی اہمیت دی جائے گی نہ کہ اس کی نظیر یعنی مثال کا مطالبہ کیا جائے گا۔

حصہ: دوم

خدا، مذہب اور سائنس

مذہب اور جدید سائنسی استدلال

سام ہیرس (Sam Harris 1976) امریکہ کے مشہور فلسفی اور مذہب کے ناقد ہیں جنھیں جدید الحاد کی نمائندہ شخصیات میں شمار کیا جاتا ہے۔ 2004 میں ان کی کتاب The End of Faith شائع ہوئی۔ اس کتاب کے بنیادی مقدمات دو ہیں۔ اول مذہبی دہشتگردی تھا جو کہ فی الوقت ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے، جبکہ دوسرا مقدمہ مذہب کی عقلی حیثیت ہے۔ مصنف اور ان کے ہم خیال ملحدین کا ماننا ہے کہ مذہب محض اندھے اور بے دلیل عقائد کا مجموعہ ہے جو انسان کو محض لغو نظریات اور توہم پرستی ہی سکھاتا ہے جن کی کوئی عقلی حیثیت نہیں۔ سام ہیرس اس مقدمے کو اپنی مذکورہ کتاب کے ایک اقتباس میں یوں پیش کرتے ہیں۔

This has always posed a special problem for religion, because every religion preaches the truth of propositions for which it has no evidence. In fact, every religion preaches the truth of propositions for which no evidence is even conceivable. This

put the "leap" in Kierkegaard's leap of faith.(The End of Faith P.23)1

عیسائیت کی تثلیث، یہودیوں کا نسلی تصور نجات، ہنود کی دیومالائی داستانیں، بدھ مت کے ماننے والوں کی خدا کے بغیر اخلاقیات کا پیچ، جین مت کی ارواح پرستی اور دیگر مذاہب میں، توہمات یقیناً اس نقطہ نظر کی حمایت کرتے ہیں۔ اس حوالے سے عام طور پر ان مذاہب سے بعض اساطیری روایات بھی پیش کی جاتی ہیں جو اس ضمن میں گو سب سے بڑا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ مذہب بے دلیل ایمان وعقائد کا مجموعہ ہے، لیکن یہ معاملہ صرف انھی مذاہب تک ہی محدود رہنا چاہیے جو ایسی تعلیمات بیان کرتے ہیں۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو بغیر کسی تعصب کے یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ دین عقل اور فطرت کی بنیاد پر قائم کردہ دلائل پر قائم ہے۔

قرآن مجید اپنی تمام تر دعوت تعصب یا جبر کی بنیاد پر نہیں بلکہ غور و فکر اور دلیل کی بنیاد پر پیش کرتا ہے۔ قرآن کا مطالبہ ہے کہ سب سے پہلے اس کتاب کا غور و فکر سے تنقیدی مطالعہ کریں، اس کی ہر ایک بات قبول کرنے سے پہلے اسے عقل اور برہان کی کسوٹی پر پرکھ لیں اور جب آپ کا قلب مطمئن ہو جائے تو اس وقت اس دعوت کو قبول کرنے میں کسی تعصب یا تامل کا اظہار نہ کریں۔ قرآن مجید کے جو مختلف نام قرآن میں بیان ہوئے ہیں ان میں ایک نام برھان ہے۔ لفظ "برھان" دراصل عقلی اور استدلالی پہلو کی وضاحت کرتا

1http://www.popeye x.com/downloads/other/Sam.Harris.-.The.End.of.Faith pdf

ہے۔[1] قرآن میں اس کے نزول کا بنیادی مقصد ہی یہ بتایا گیا ہے کہ انسان عقل و شعور سے کام لے کر بات کو سمجھے۔[2] قرآن مجید یہ اعلان کرتا ہے کہ:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُبِينًا

اے لوگو! بلاشبہ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس ایک برھان آچکا ہے اور ہم نے تمہاری طرف ایک واضح نور اتارا ہے۔(سورۃ النساء۔ آیت 174)

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ

یقیناً خدا کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔(سورۃ الانفال۔ آیت 22)

ایک اور آیت میں قرآن عقل سے کام نہ لینے والوں کو بلا تخصیص جانوروں سے مترادف قرار دیتا ہے اسلام کی مقدس ترین کتاب قرآن مجید میں بے دلیل بزرگوں کی اندھی تقلید پر بھی شدید تنقید کی گئی ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس (کتاب) کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کی، تو وہ کہتے ہیں: نہیں ہم تو اسی طریقے پر چلیں گے جس پہ ہم نے اپنے آباء و

---

[1] سورۃ الانفال۔ آیت 22

[2] سورہ یونس۔ آیت 2

اجداد کو پایا ہے۔ اگر ان کے آباء واجداد نے نہ عقل سے کام لیا ہو اور ہدایت یافتہ وہ ہدایت یافتہ نہ ہوں تو؟۔(سورۃ البقرۃ۔ آیت 170)

وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا

(ایمان والے ایسے ہوتے ہیں کہ) جنہیں جب اُن کے رب کی آیات سنائی جاتی ہے تو وہاں پر بہرے اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے (بلکہ غور و فکر بھی کرتے ہیں)۔

(سورۃ الفرقان۔ آیت 73)

قرآن کریم میں اس قسم کی آیات بکثرت موجود ہیں جو یہ واضح کرتی ہیں کہ اسلام کی پوری بنیاد ہی عقل و استدلال پر قائم ہے۔ قرآن مجید ایمانیات کے ضمن میں دوسرے مذاہب کی نسبت عقل انسانی کی تسلی کے لئے زبردست دلائل پیش کرتا ہے اور سائنسی حقائق کی طرح یہ لحاظ سے قابل آزمائش (Testable) ہیں اور ہم خود اس کا عقلی تجزیہ کر سکتے ہیں۔

اسلام کا وہ پہلو جس کا تعلق رسم و رواج اور معیشت و معاشرت سے ہے۔ اس پہلو میں بھی اسلام اپنے احکامات کے ساتھ اس کے اسرار و رموز سے آگاہ کرتا ہے۔ جس طرح دیگر سوشل سائنسز کا تجزیہ کیا جاتا ہے اسی طرح اسلام کے ان احکامات کا بھی معروضی انداز میں عقلی تجزیہ (Rational analysis) کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اسلام معیشت کے بارے میں جو اصول فراہم کرتا ہے آپ اس کا تجزیہ کر سکتے ہیں، اسلام کے معاشرتی قوانین ہی میں انسانیت کی فلاح ہے، اس دعوے کو بھی آپ اچھی طرح پرکھ سکتے ہیں بلکہ فی زمانہ انسان نے جب بھی اسلامی اصولوں کے مقابل کوئی نظام کھڑا کیا ہے وقت گزرنے کے ساتھ خود ہی واضح ہو گیا کہ ان انسانی قوانین میں کتنے سقم تھے۔ لہٰذا اسلام کا دعویٰ اپنی جگہ برحق ہے کہ اس سے بہتر نظام نوعِ انسانی کے لیے کوئی نہیں ہو سکتا۔

دوسری طرف اسلام کا وہ پہلو ہے جس کا تعلق ہماری محسوس دنیا کے بجائے مابعد الطبیعات (Meta physics) سے ہے۔ عام طور پر ناقدین کی طرف سے انھی امور سے متعلق بے دلیل ہونے کی بحث کی جاتی ہے۔ خدا تعالیٰ کا وجود، قضاء و قدر، عبادت، الہام، حیات بعد الموت، جنت، دوزخ وغیرہ انھی مباحث میں شمار ہوتے ہیں جو ان مفکرین کے نزدیک ناقابل یقین امور ہیں۔ ان امور کے بے دلیل ہونے کا یہ خیال نیا نہیں بلکہ ماضی میں بھی یہ خیال عام رہا ہے۔ جس کی بنیاد ماضی کا مقبول فلسفۂ علمیات منطقی تجربیت (Logical Empiricism) ہے۔ یعنی جو چیز حواس خمسہ یعنی دیکھنے، سننے، چکھنے، محسوس کرنے یا سونگھنے کے قابل نہیں ہوتی اسے خلافِ عقل قرار دے دیا جائے۔ اس نظریے کی رُو سے تمام علم کی بنیاد حسیات پر ہے۔ مذہبی عقائد و نظریات کی چونکہ کوئی واضح ٹھوس دلیل نہیں ہوتی، نہ یہ ہمارے حواس کی زد میں آسکتے ہیں اور نہ ہی ان کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے اس لیے ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ماضی کے مشہور مغربی مفکر Edward H. Cotton بھی مذہب کے بارے میں یہی دعویٰ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

Religion actually proves nothing; neitherdoes philosophy—in the sense in which men require proof to-day.Philosophy investigates and interprets.Religion professes and has faith. But neither gives to reason convictions which can withstand the attacks of doubt and despair when the "lights are low and all the wheels of being slow."

"مذہب اور فلسفہ دونوں ہی اس لحاظ سے کوئی ثبوت فراہم نہیں کرتے جس کا تقاضا دورِ حاضر کا انسان کرتا ہے۔ فلسفے کا کام محض تفتیش اور توضیح کرنا ہے اور مذہب کا بھی دعویٰ اور اپنا ایک نظریہ ہے لیکن دونوں ہی (اس ضمن میں) کوئی ایسی دلیل نہیں دیتے جو انسانی مایوسی اور شکوک کے مقابلہ کر سکے۔"

تجربیت کا فلسفہ اگرچہ مغربی عقلیت پسندی کی بنیاد سمجھی جاتی ہے مگر 1920 کے بعد طبیعات میں ہونے والی تحقیقات مثلاً ایٹم کے وجود کو قبول کرکے اس فلسفے کو یکسر مسترد کرچکی ہے۔ آج کی طبعیات محسوسات کے قفس سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ اب سائنس بھی انرجی اور ویو میکانکس (Wave Mechanics) جیسے بے شمار ناقابل مشاہدہ امور تسلیم کرکے اسی ایمان کے قفس میں ہے۔ لیکن یہ فلسفہ تجربہ گاہوں میں مسترد کیے جانے کے باوجود آج بھی بعض ناقدینِ مذہب کے اذہان پر غالب ہے اور وہ مذہبی عقائد کو ان ناقابل مشاہدہ اور حسیات سے ماوراہونے کی وجہ سے تسلیم نہیں کرتے۔

اسی مسترد شدہ فلسفے کی بدولت مخالفین مذہب دراصل طریق استدلال کو نہ سمجھنے کے غلطی میں مبتلاء ہیں۔ وہ مذہب کے ان غیبی امور کو بھی براہ راست (Direct Observation) سمجھنا چاہتے ہیں جس کا تعلق استنباطی استدلال (Inference reasoning) سے ہے۔ مذہب کے ان امور کا تعلق چونکہ غیبیات سے ہے اس لیے اس پہلو کا مطالعہ براہِ راست استدلال کے بجائے استنباط کے منطقی اصول سے اسی طرح مطالعہ کرکے تسلیم کرنا چاہیے جس طرح اس اصول سے آج جدید سائنس کائنات سے متعلق ہونے والی تحقیقات میں ناقابل مشاہدہ امور کو معقول (Valid) سمجھتی ہے۔

غور کیا جائے تو مذہبی استدلال اور سائنسی استدلال دونوں ہی یکساں طریقے سے اپنا دعویٰ ثابت کرتے ہیں۔ البتہ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ چونکہ سائنس دانوں کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ توانائی اور دیگر ناقابل مشاہدہ امور کو براہ راست کسی تجربی طریقے سے سمجھ سکیں، اس لیے ان کے بارے میں قائم ہونے والے تصورات میں ہمیشہ تشکیک کا پہلو موجود رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس کے نظریات بدلتے رہتے ہیں۔ جبکہ مذہب اس معاملے میں پہلے درجے پر ہی منبع علم وحی (الہامی کتاب) کو امتحان سے گزار کر بغیر شک کے قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ اس کے حاصل شدہ تصورات ہر کسی قسم کی تشکیک سے بالاتر ہوں۔ تاہم اس بات کی اجازت ہے کہ اسے بھی علم و دانش کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ سر دست ہم اسی امر پر زور دیں گے ارباب عقل سائنس کی طرح مذہب کے ناقابل مشاہدہ امور کا مطالعہ استنباط کے اصول سے سمجھ کر اور ان پر ایمان لائیں۔ قرآن مجید کی بھی یہی دعوت ہے کہ وہ حقائق جو آنکھوں سے دیکھے نہیں جا سکتے، انھیں عقلی دلائل کی بنا پر مانا جائے جسے قرآن کی اصطلاح میں ایمان بالغیب کہتے ہیں۔

مذہب اور سائنس کی قطعیت

Certainty in Science and Faith

فیتھ اینڈ ریزن (Faith and Reason) مانچسٹر کالج آکسفورڈ کا تحقیقی جرنل ہے جس کے شمارہ نمبر (1992)134 میں ڈاکٹر پال بید ھم کا ایک مقالہ شایع ہوا۔ پروفیسر بید ھم مطالعاتِ مذاہب اور علم الٰہیات کے محقق ہیں۔ اپنے اس مقالے میں وہ لکھتے ہیں کہ ایک مذہبی فلاسفر کی حیثیت سے میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوں کہ ایمان کو کبھی بھی سائنسی علم والی قطعیت کے درجے پر نہیں رکھا جاسکتا۔ ان کے الفاظ یوں تھے:

As a philosopher of religion, I feel compelled to acknowledge that faith could never be placed on the same level of certainty as scientific knowledge.[1]

ڈاکٹر بید ھم کے یہ الفاظ دراصل مذہب کے متعلق آج کے جدید ذہن میں پائے جانے والے خیال کے بھرپور عکاس ہیں۔ ماضی میں تجرباتی سائنس کی حیرت انگیز ترقی کی بدولت بعض لوگوں کو یہ خیال ہونے لگا کہ جس طرح سائنس ہمیں حقائق سے آگاہ کرتی ہے اور اپنے علم یعنی تصورات و نظریات کو تجربہ گاہ کے امتحان سے گزار کر حقیقت ثابت کرتی ہے مذہب اپنے تصورات کو اس طرح ثابت نہیں کرتے اس لیے مذہب اوہام جبکہ سائنس حقائق کا مطالعہ پیش کرتی ہے۔ ہم ایک بار پھر ڈاکٹر بید ھم کے الفاظ پر غور کریں تو ہمیں بنیادی طور پر دو دعوی (Arguments) نظر آتے ہیں۔

---

1. حوالہ: مولانا وحید الدین خان۔ فکر اسلامی۔ صفحہ 114۔

1- سائنسی علم قطعیت کے حامل ہوتے ہیں۔

2- مذہب کو سائنسی قطعیت کے درجے پر نہیں رکھا جا سکتا۔

یہاں سب سے پہلے ہمیں اس دعوے کو پرکھ لینا چاہیے کہ کیا واقعی سائنس سے حاصل شدہ نظریات اپنے اندر قطعیت رکھتے ہیں؟

ہم جانتے ہیں سائنس کی بنیاد مشاہدات اور تجربات سے حاصل کردہ معلومات پر ہوتی ہے جس میں بشری خامیوں اور کوتاہیوں کا امکان ہوتا ہے۔ سائنس کا نکتہ آغاز مفروضات (Hypothesis) پر ہے جو مشاہدہ اور تجربہ کے مختلف مراحل سے گزر کر سائنسی اعتبار سے معقولیت (Scientifically Valid) کے زمرے میں آتا ہے۔ یہ معقولیت بھی قطعی ہونے کے بجائے درجۂ امکان (Degree of probability) کی حیثیت رکھتی ہے۔ سائنس چونکہ انسانی استعداد سے تشکیل پانے والا علم (Human Acquired Wisdom) ہے اس لیے اپنے میدان میں استنادی درجہ رکھنے کے باوجود یہ درجہ ایقان کو نہیں پہنچتا۔ سائنس اپنے بیشتر معاملات میں قائم شدہ نظریات کو قول فیصل تصور نہیں کرتی بلکہ یہ نظریات حتمی قطعیت پر فائز ہونے کے بجائے ہر لحظہ مشکوک رہتے ہیں اور زمانے کے ساتھ اس کی غلطیاں بھی واضح ہوتی رہتی ہیں۔ کائنات کی عمر، روشنی کی رفتار، بلیک ہول، بگ بینگ کی تفصیلات جیسے کئی بنیادی نظریات ہیں جو تاحال تشکیک کے قفس میں ہیں اور مختلف تحقیقات و تجربات انھیں مشکوک بنا رہے ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ سائنس دان ہمیشہ اپنی تحقیقات و استنباط کو قطعی اور مطلق و جامد (Absolute or Unchangeable) کے بجائے اسی طرح پیش کرتے ہیں کہ موجودہ معلومات کی بنیاد پر یہ رائے یا توجیہہ زیادہ معقول ہے۔ سائنسی تصورات میں عدم قطعیت کا اقرار خود سائنس دان بھی کرتے آئے ہیں بلکہ ان

کے نزدیک یہی عدم قطعیت دراصل سائنسی علوم کے ارتقاء کا باعث ہے۔فرانس کی Mediterranean یونیورسٹی میں فزکس کے محقق اور کئی کتابوں کے مصنف CarloRovelli سائنسی قطعیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

Science is not about certainty. Science is about finding the most reliable way of thinking at the present level of knowledge. Science is extremely reliable; it's not certain. In fact, not only is it not certain, but it's the lack of certainty that grounds it. Scientific ideas are credible not because they are sure but because they're the ones that have survived all the possible past critiques.[1]

سائنس کا تعلق قطعیت سے نہیں ہے بلکہ دستیاب معلومات کی بنیاد پر نظریات کے قابل اعتماد ہونے سے ہے۔ سائنس یقیناً قابل اعتماد ہے لیکن قطعی نہیں ہے۔بلکہ قطعیت سے محرومی ہی اس کی بنیاد ہے۔سائنسی تصورات اس لیے قابل اعتماد نہیں ہیں کہ یہ یقینی و حتمی جواب دیتے ہیں بلکہ اس لیے قابلِ اعتماد ہیں کہ یہ تمام تر تنقیدوں کے باوجود عقلی اعتبار سے سلامت ہیں۔یہی بات مغرب کے مشہور فلسفی کارل پاپر نے اپنی تصنیف "سائنسی دریافت کی منطق" میں اس طرح بیان کی۔

[1] www.newrepublic.com/article/118655/theoretical-phyisicist-explains-why-sciencc-not-about-certainty+&cd=2&hl=en&ct=clnk&gl=pk

ہمیں سائنس کو ایک "مجموعۂ علم" کی بجائے "مفروضوں کے ایک نظام" کے طور پر دیکھنا چاہیے، یعنی اندازوں یا توقعات کا ایک نظام جو اصولی طور پر تو قابل دفاع نہیں مگر ہم اسے اس وقت تک استعمال کرتے رہیں گے جب تک کہ وہ تجربے کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے اور اس بارے میں ہم کبھی یہ کہنے میں حق بجانب نہیں کہ ہمیں علم ہے کہ یہ "سچ" یا "کم و بیش یقینی" یا پھر "احتمالی" ہے۔[1]

اس موقع پر ایک مشہور سائنسی اصطلاح Scientifically Proven کی وضاحت بھی ضروری ہے جسے بالعموم حقیقت کے مترادف سمجھ لیا جاتا ہے۔ سائنس کے ایک ادنیٰ طالب کو بھی اس بات سے واقف ہونا چاہیے کہ اس خاص اصطلاح سے مراد قطعیت کے بجائے کسی مفروضے کا سائنٹفک میتھڈ سے گزر کر معقولیت تسلیم کرنا ہے۔ یہ تسلیم شدہ تصورات، اصول و ضوابط اور دستیاب معلومات کی رو سے تسلی بخش اور درست ہو سکتے ہیں مگر انھیں صداقت کہنا، بلاجواز منطقی قطعیت کے درجے میں رکھ کر "حقیقت مطلق" ماننا اور پھر مذہب سے اس کا تقابل کرنا ایک بڑی فنی غلطی ہے۔ چنانچہ یہ بات سورج کی طرح واضح ہو جانی چاہیے کہ جس قطعیت کا مطالبہ مذہب سے کیا جاتا ہے خود سائنس بھی اپنے بے شمار نظریات میں اس قسم کی قطعیت سے محروم ہے۔

دوسری جانب مذہب (اسلام) کا موضوع انسان اور پوری کائنات کا نصب العین ہے۔ اس لیے مذہب اپنے باب میں سائنس کی طرح مشکوک قطعیت پیش نہیں کرتا بلکہ یقینی حیثیت

---

[1] Karl Popper, The Logic of Scientific Discovery, Routledge Classics, 2nd Editio[n] 20[illegible]

سے پیش کرتا ہے۔ رہی یہ شرط کہ کسی چیز کو اسی وقت تک قطعی ماننا چاہیے جب تک مشاہدات اور تجربات اس پر معقول تنقید نہ کر دے، تو یہی بات قرآن بھی کہتا ہے کہ قرآن کی قطعیت کا ہر اعتبار سے امتحان لے لیا جائے اور اسے اطمینان کے بعد اسے قبول کیا جائے۔ انسانی تاریخ شاہد ہے کہ نہ اس منبع علم یعنی قرآن کی قطعیت کبھی بھی چیلنج کی جا سکی ہے اور نہ ہی اس پر کوئی ایسی تنقید ہو سکی ہے جو اسے باطل ٹھہرا دے۔

منبع علم "قرآن" کی قطعیت کیسے پرکھی جائے؟

"مذہب اور جدید استدلال" کے تحت ہم یہ بات کہہ آئے ہیں کہ جس طرح دیگر امور کا عقلی تجزیہ (Rational analysis) کیا جا سکتا ہے اسی طرح مذہب کا بھی عقلی تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ کسی سائنسی نظریے کی قرآن کی قطعیت کا حال بھی اس کے عقلی مطالعے کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ قرآن نے اس معاملے میں مطالعے کا ایک بہترین تنقیدی اصول خود قرآن نے مقرر کیا ہے۔ قرآن کی ایک آیت یہ ہے:

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا

یعنی اگر یہ (قرآن) اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس کے اندر بڑا اختلاف پاتے (سورۃ النساء۔ آیت: 82)

اس اصول کی روشنی میں ہمیں قرآن مجید کی صداقت اور اس کی قطعیت کو جانچنے کا بہترین معیار ملتا ہے۔ قرآن کے بیان کا ایک حصہ وہ ہے جس میں وہ انسان سے مخاطب ہو کر اسے کائنات پر غور و فکر کی ترغیب دیتا ہے۔ اس ضمن میں زمین و آسمان، تخلیق، انسانی جسم اور دیگر طبعی دنیا کے بارے میں بھی حقائق سے پردہ اٹھاتا ہے۔ یہ موضوع، قرآن اور سائنس

کے درمیان مشترک ہے۔اس مشترک بنیاد کو لے کر ایک ناقد کو چاہیے کہ وہ قرآن مجید میں بیان کردہ حقائق کا علمی مسلمات (facts) سے تقابل کر کے دیکھے۔ یہ ثابت ہو گا کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے علمی اعتبار سے قطعیت کی حامل ہے اور مسلمہ عقلی معیار پر ثابت ہو رہی ہے۔

سائنس اور انکارِ خدا

دی گرینڈ ڈیزائن(The Grand Design) اسٹیفن ہاکنگ کی تصنیف ہے جنھیں سائنس کی دنیا میں آئن سٹائن کے بعد سب سے ذہین اور ماہر ترین سائنسدان سمجھا جاتا ہے۔ ان کی یہ کتاب 2010 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں اسٹیفن ہاکنگ نے یہ دعوی کیا ہے کہ کائنات اور دنیا میں موجود حیات کی معرفت کے لیے ہمیں کسی خدا کی ضرورت نہیں ہے بلکہ قدرت کے قوانینLaws of Natureہمیشہ سے ہیں اور وہ ہی اس گرینڈ ڈیزائن کی علتCauseہیں۔ ہاکنگ اپنی اسی کتاب میں یہ الفاظ بھی کہتے ہیں:

Science makes God unnecessary

سائنس نے خدا کو غیر ضروری ثابت کر دیا ہے

سائنسی دریافت کی بنیاد پر بعض جید سائنس دانوں میں خدا کے انکار کا خیال انیسوی صدی کے بعد رائج ہوا ہے۔ نیوٹن کے بعد اس وقت یہ تاثر پیدا کیا جانے لگا کہ علوم جدیدہ نے خدائی ایمان کی پوری عمارت کو مسمار کر دیا ہے۔ اس پوسٹ ماڈرن دنیا میں اب خدا کی کوئی جگہ باقی نہیں رہی ہے۔ حتیٰ کہ مغرب میں خدا کی موت اور خدا کی تدفین جیسے نعرے بھی بلند ہونے لگے۔

ملحدین کے نقطہ نظر کے مطابق پہلے زمانوں میں انسان کا علم محدود تھا، اس وجہ سے اسے کائنات کی توجیہہ کا یہی تصور ملا کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے بارے میں مان لیا جائے کہ اسے کوئی خدا چلا رہا ہے۔ لیکن سائنسدانوں نے ایسے قوانین دریافت کر لیے ہیں جن کی مدد

سے یہ جانا جا سکتا ہے کہ یہ کائنات کیسے چل رہی ہے۔ اب ضرورت نہیں رہی کہ خدا کے تصور کے ساتھ جڑا جائے بلکہ ہمیں فطرت کے ان قوانین کا علم ہو چکا ہے جن کی مدد سے یہ کائنات چل رہی ہے۔ جیسے پہلے انسان سمجھتا تھا کہ سورج طلوع و غروب ہوتا ہے۔ اس نے ایک خدا فرض کر لیا جو سورج کو نکالتا اور غروب کرتا ہے۔ جدید سائنس نے یہ ثابت کر دیا کہ سورج طلوع و غروب نہیں ہوتا بلکہ زمین گردش کرتے ہوئے اس کے سامنے آ جاتی ہے۔ اس وجہ سے اب اس خدا کو بھی ماننے کی ضرورت نہیں رہی جو سورج کو کنٹرول کر رہا ہے۔ سائنس میں ہونے والی ہر ایک نئی پیش رفت دراصل اس تابوت کی ایک اور کیل ہے جس میں خدا کو بند کر دیا گیا ہے۔

اس نقطہ نظر کا جائزہ لینے سے قبل یہ غلط فہمی رفع کر لینا ضروری ہے کہ سائنس گو کہ آج بے پناہ ترقی کر چکی ہے لیکن سائنس نے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا کہ پہلے جو تفصیلات معلوم تھیں، ان میں کچھ مزید اضافہ کر دیا ہے۔ ان معلومات میں اضافے کے نتیجے میں خدا کا تصور کسی طرح بھی بے کار قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اگر ہمیں کسی پراسیس کے بارے میں اضافی معلومات مل جائیں تو کیا اس سے اس بات کی نفی ہو جاتی ہے کہ اس پراسیس کا کوئی خالق موجود نہیں ہے؟ ملحد سائنس دانوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ تخلیق اور "طریقۂ تخلیق" کو باہم مخلوط کر رہے ہیں۔ کسی شے کی طریقۂ تخلیق کا علم ہو جانا اس بات کا مجاز نہیں کہ اس شے کا خالق کوئی نہیں ہے۔ مولانا وحید الدین خان ملحدین کے اس خیال کے بارے میں لکھتے ہیں:

> یہ صحیح ہے کہ سائنس نے کائنات کے بارے میں انسان کے مشاہدے کو بہت بڑھا دیا ہے، اس نے دکھا دیا ہے کہ وہ کون سے فطری قوانین ہیں، جن میں یہ کائنات جکڑی ہوئی ہے اور جس کے تحت وہ حرکت کر رہی ہے۔ مثلاً پہلے آدمی

صرف یہ جانتا تھا کہ پانی برستا ہے، مگر اب سمندر کی بھاپ اٹھنے سے لے کر بارش کے قطرے زمین پر گرنے تک کا وہ پورا عمل انسان کو معلوم ہو گیا ہے، جس کے مطابق بارش کا واقعہ ہوتا ہے۔ مگر یہ ساری دریافتیں صرف واقعہ کی تصویر ہیں، وہ واقعہ کی توجیہ نہیں ہیں۔ سائنس یہ نہیں بتاتی کہ فطرت کے قوانین کیسے قوانین بن گئے، وہ کیسے اس قدر مفید شکل میں مسلسل طور پر زمین و آسمان میں قائم ہیں، اور اس صحت کے ساتھ قائم ہیں کہ ان کی بنیاد پر سائنس میں قوانین مرتب کیے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرت جس کو معلوم کر لینے کی وجہ سے انسان یہ دعوی کرنے لگا ہے کہ اس نے کائنات کی توجیہ دریافت کر لی، وہ محض دھوکا ہے۔ یہ ایک غیر متعلق بات کو سوال کا جواب بنا کر پیش کرنا ہے، یہ درمیانی کڑی کو آخری کڑی قرار دینا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی مشین کے اوپر ڈھکن لگا ہوا ہو تو ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ چل رہی ہے، اگر ڈھکن اتار دیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ باہر کا چکر کس طرح ایک اور چکر سے چل رہا ہے اور وہ چکر کس طرح دوسرے بہت سے پرزوں سے مل کر حرکت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے سارے پرزوں اور اس کی پوری حرکت کو دیکھ لیں، مگر کیا اس علم کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے مشین کے خالق اور اس کے سبب حرکت کا راز بھی معلوم کر لیا؟ کیا کسی مشین کی کارکردگی کو جان لینے سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ خود بخود بن گئی ہے؟ اور اپنے آپ چلی جا رہی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو کائنات کی کارکردگی

کی بعض جھلکیاں دیکھنے سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ یہ سارا کارخانہ اپنے آپ قائم ہوا اور اپنے آپ چلا جا رہا ہے؟[1]

---

[1] ... خان۔ مذہب اور جدید چیلنج۔ ص 23-22۔ دہلی: مکتبہ ... www.cpsglobal.org (ac 13 Oct ... 20 1)

نظریہ ارتقا اور خدا

ارتقاء کا نظریہ حالانکہ قدیم زمانے سے لوگوں کے ذہنوں میں موجود رہا ہے ،یونان کے کئی فلاسفر ارتقاء کے مکمل قائل تھے، لیکن انیسویں صدی سے پہلے یہ ایک گم نام سا نظریہ تھا جسے باقاعدہ طور پر مرتب نہیں کیا گیا تھا۔ نیز اس میں الحاد کا کوئی خاص پہلو نہ تھا، لیکن مشہور ماہر حیاتیات سر چارلس ڈارون نے صدیوں سے چلے آ رہے اس خیال کی مخالفت کی کہ انسان کو کامل صورت میں ایک ساتھ ایک ہی وقت میں تخلیق کیا گیا ہے۔ اس نے انسان کی تخلیق کو ایک لگے بندھے قانون فطرت کے تحت ہونے والے ارتقاء کا نتیجہ قرار دیا۔ ڈارون خدا پرست انسان تھا، اس نے اپنی ابتدائی تعلیم دینیات کے شعبے میں ہی حاصل کی تھی لیکن بعد میں اس میں تشکیک (Agnosticism) کے اثرات نمایاں ہوئے۔ اردن کے بعد ہونے والی مزید تحقیقات نے اس نظریے کو سائنس کی دنیا میں ایک مسلمہ اصول بنا دیا اور اب یہ نظریہ بتاتا ہے کہ روئے زمین پر اربوں سال پہلے ساحل سمندر سے زندگی کی ابتداء ہوئی۔ پھر اس سے نباتات اور اس کی مختلف انواع وجود میں آئیں۔ پھر نباتات ہی سے ترقی کرتے کرتے حیوانات پیدا ہوئے۔ انہی حیوانات میں سے ایک بندر تھا، جس سے نیم انسانی حالت کے مختلف مدارج سے ترقی کرتا ہوا موجودہ انسان کا وجود ہوا۔

اس نظریے کا سہارا لیتے ہوئے ملحدین نے یہ دعویٰ کیا کہ تخلیق انسانی کی توجیہہ اب بیان کر دی گئی ہے لہٰذا اب کسی خدا کو ماننے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔

ہماری نظر میں نظریہ ارتقا کو خدا کے وجود کے انکار کی اساس بنانا سوء فہم اور بڑی حد تک مذہب سے مخاصمت کا نتیجہ ہے کیونکہ اس بات سے خدا کے وجود یا عدم وجود پر کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کائنات اپنی موجودہ صورت میں ارتقا کا سفر طے کر کے پہنچی ہے یا اچانک پیدا ہوئی ہے، بلکہ یہ موضوع ہی مذہبی مباحث سے کلیتاً خارج ہے۔ البتہ مذہب اس بارے میں ضرور بحث کرتا ہے کہ کائنات جس طرح بھی تخلیق ہوئی، اپنی اصل میں یہ ایک خالق کی ہی مرہونِ منت ہے۔

جب تک ہم زمین پر پہلی زندگی کا درست تعین نہ کر لیں اس وقت تک ہمارے سامنے نظریۂ ارتقا کی بنیاد ہی نہیں بن پاتی ہے۔ سالمے کی صورت میں جو پہلی زندگی زمین پر ظاہر کی گئی اس کا میکینزم بھی اسی قدر پیچیدہ ہے جتنا آخری نوع کے انسان کی خلیاتی اکائی (Cell nucleus) کا میکینزم ہے۔ اس پہلی زندگی کے میکینزم کی اس قدر پیچیدگی یہ بتاتی ہے کہ اس کے مرکبات (Compounds) بننے میں اتفاقات کا عرصہ اربوں کھربوں سال پر بھی لگ جائے تو بھی ایک مثبت اتفاق ہونا ممکن نہیں ہے اور اگر ایسا ہو گیا ہے تو یقیناً یہ معجزہ ہی ہوا ہے جو اتنے کم عرصے میں زمین پر پہلی زندگی کے آثار نظر آ گئے۔

اصل ارتقاء کو مان کر خدا کا انکار کرنے والے جب تخلیق انسانی کی بات کرتے ہیں تو وہ سرچشمۂ حیات (Origin of life) کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ زندگی کی ابتداء کے متعلق خود ہی پہلے سے ایک سالمہ (self-replicating molecule) کا وجود فرض کر لیتے ہیں اور پھر اسی پر پورے نظریۂ ارتقاء کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ حالانکہ اس نظریے کو مان کر سب سے پہلا سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ ایک بے شعور اور بے حیات مادہ سے کس

طرح ایک جاندار (Living thing) وجود میں آگیا؟ اور پھر خود مادہ بھی اپنے وجود کے لیے ایک خالق کا محتاج ہے از خود کہاں سے معرض وجود میں آیا؟

نظریہ ارتقاء کسی طرح بھی پیش کر دیا جائے؛ یہ زندگی کی توجیہہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ نظریہ خدا سے نہیں بلکہ اس کی تخلیقی اسکیم سے متعلق ہے۔ اگر کسی زمانے میں اس نظریے کے حق میں ٹھوس شواہد دستیاب ہو جائیں اور تجربہ گاہوں میں اس نظریے پر مہر ثبت ہو جائے تو بھی اس سے خدا کے عدم وجود کا کوئی علمی و سائنسی جواز نہیں ملتا۔ فرق صرف یہ ہو گا کہ پہلے عقیدہ یہ تھا کہ خدا نے الگ الگ نوع کی مخلوق پیدا کی اور اب یہ ہو جائے گا کہ خدا نے ایک ہی نوع سے زمین پر سارا تخلیقی عمل کیا۔ خدا کی ذات کو ان دونوں ہی نظریات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

کیا سائنس خدا کا انکار کر سکتی ہے؟

یہ سوال یہ کیا سائنس خدا کا انکار کر سکتی ہے؟ منطقی طور پر ہی غلط ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ خدا کے وجود کا انکار سائنس کا دائرہ کار میں نہیں آتا۔ سائنس کا دائرہ کار مادہ، توانائی اور ان کے طبعی قوانین تک محدود ہے، جب کہ خدا ان قوانین کا خالق ہے جو نہ ہی مادہ ہے اور نہ توانائی۔ سائنس تجربہ گاہوں سے نشو نما پاتی ہے جبکہ خدا کی ذات خدا کوئی مادی تصور نہیں ہے جسے تجربہ گاہوں میں ثابت کیا جائے۔ بلکہ یہ کام خالصتاً عقل، استدلال کا ہے اور خدا کی معرفت استدلال سے ہی ممکن ہے۔

دوسری وجہ سائنس علم کی محدودیت ہے۔ اپنے محدود علم کی بنیاد پر سائنس کے لیے کسی کی عدم موجودگی کی گواہی دینا منطق کی روشنی میں ناقابل اعتبار ہے۔ زمین پر سفید کوے کی معدومیت ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ پہلے زمین کے ہر کون و مکان اور فضائی دنیا میں اس کی تلاش کریں اور اس پورے علم کے بعد آپ زمین پر سفید کوے کی معدومیت کا دعویٰ کریں۔ اسی طرح قطعی طور پر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ خدا نہیں ہے، ہمارے لیے مادی و غیر مادی دنیا کا کلی علم (Infinite knowledge) ہونا لازم ہے۔ کوئی بھی شخص یا سائنس کی جانب سے خدا کے وجود کا انکار اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ عالم شہود اور عالم غیب ہر دو سے مکمل طور پر باخبر ہو اور پھر اپنے اس کلی علم کی بنیاد پر وہ اس کا انکار کرے کہ خدا موجود نہیں ہے۔ جبکہ انسانی عالم یعنی سائنس کی حالت یہ ہے کہ ہماری کہکشاں جو کائنات

ے ایک انتہائی چھوٹے سے جزو کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے بھی بہت سے سربستہ راز سے سائنس اب تک پردہ نہیں اٹھا سکی ہے۔ سائنس داں ہمیشہ سے یہ تسلیم کرتے آئے ہیں کہ ابھی وہ کائنات کے بارے میں مکمل طور پر کچھ بھی نہیں جانتے۔ مشہور ملحد ماہر طبعیات برین ج کس(b.1968) کے بقول اس وقت سائنس %96 کائنات کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔[1] تخلیق کائنات، انسانی ذہن اور مادہ سے لے کر بلیک ہول تک کائنات کے اپنے دامن میں ایسے راز سمیٹے ہوئے ہے جن کے بارے میں سائنس اب تک حتمی طور پر کچھ نہیں جانتی۔

اس وقت سائنس کی حالت گویا ساحل سمندر پر کھڑے اس شخص کی سی ہے جو سطح بحر اور اس سے اوپر فضا کا مشاہدہ کر رہا ہے لیکن پانی کی سطح کے نیچے بہت سی مخلوقات اس کے مشاہدے سے باہر ہے چنانچہ وہ اپنے حواس ظاہرہ سے ان کے وجود کا ثبوت نہیں دے سکتا مگر ان کے عدم وجود پر بھی کسی استدلال کا مستحق نہیں ہے۔ اس موقع پر قرآن مجید کا یہ اعلان سامنے رکھنا چاہیے۔

أَمْ عِندَهُمُ ٱلْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ

کیا اِن کے پاس غیب کے حقائق کا علم ہے کہ اُس کی بنا پر یہ لکھ رہے ہوں؟

(سورہ قلم۔ آیت 47)

---

[1] http://www.theguardian.com/theobserver/2010/...-brian-cox-solar-system-intervie

خدا اور کائنات کی ازلیت

منکرین خدا کا ایک بہت پرانا استدلال ہے کہ کائنات کو اگر کسی خالق کی تخلیق تسلیم کر لیا جائے تو لازما" ایک خالق کے وجود کو بھی ماننا پڑے گا اور از روئے منطق اسے ازلی تسلیم کرنا پڑے گا، اس مسئلے کا حل انہوں نے اپنے تئیں یہ نکالا کہ بجائے خالق کے کیوں نہ کائنات کو ازلی مان لیا جائے۔

جبکہ سائنس ہمیں یہ بتاتی ہے کہ کائنات ازلی نہیں ہے بلکہ اس کی ایک متعین ابتداء ہے، کائنات کی اب تک ایسی کوئی صفت علماء سائنس کے علمی زخیرے میں شامل نہیں ہو سکی ہے کہ جس کی بنیاد پر کائنات کو خود اپنا خالق فرض کیا جا سکے، اگرچہ انیسویں صدی تک منکرین کی اس دلیل میں ایک ظاہری فریب حسن موجود تھا لیکن حرکیات کے دوسرے قانون Law of Thermodynamics کے انکشاف کے بعد یہ دلیل بالکل بے بنیاد ثابت ہو چکی ہے۔ بعض ملحدین کے نزدیک قانون حرکیات کے مطابق انرجی نہ ہی پیدا کی جا سکتی ہے اور نہ فنا کی جا سکتی ہے، اور چونکہ مادہ موجود ہے اس لیے یہ ازلی ہونا چاہیے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس کائنات کی تنظیم و ترتیب کو حکمت و شعور سے عاری بے جان مادہ سے نسبت دینے کے بجائے یہ زیادہ معقول نہیں کہ ایک صاحب و شعور ہستی نے اسے تخلیق کیا۔

سائنس کے ایک قانون، قانون ناکارگی Law of Entropy کے مطابق قوت اور حرارت مسلسل خرچ ہوتی رہتی ہے اور اس کے سبب ایک پُر قوت وجود مسلسل ایک بے حرارت وجود میں تبدیل ہوتا رہتا ہے، یعنی اجزام سماوی سے مسلسل حرارت خارج

ہو رہی ہے اور ایک وقت آئے گا کہ جب تمام اجسام بے قوت اور تاریک ہو کر رہ جائیں گے اور زندگی اپنا وجود کھودے گی۔

دور جدید کی سائنسی تحقیقات سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ کائنات ازل سے موجود نہیں ہے بلکہ ایک متعین وقت پر اور ایک متعین قوت کے ساتھ وجود میں آئی ہے، اور اب مسلسل اپنے انجام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اسی جدید تحقیق کا حوالہ دیتے ہوئے ایک امریکی ماہر حیوانات ایڈورڈ لوتھر کیسل لکھتے ہیں:

> "غیر ارادی طور پر سائنس کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا کہ کائنات اپنا ایک آغاز رکھتی ہے، اور ایسا کرتے ہوئے اُس نے خدا کی صداقت کو ثابت کر دیا ہے، کیونکہ جو چیز اپنا ایک آغاز رکھتی ہو وہ خود بخود شروع نہیں ہو سکتی، یقیناً وہ ایک محرکِ اول یعنی ایک خالق یا خدا کی محتاج ہے۔ (The Evidence of God p.51)

کیا کائنات اتفاقی حادثہ ہے؟

الحادی نظام فکر کی رُو سے تمام کائنات کا مبداء اوّل اور اساسی عنصر مادہ ہے جس کے علاوہ کوئی شے حقیقی وجود نہیں رکھتی۔ یہ پوری کائنات ایک مقدم مادے کے اتفاقی ارتقا کا نتیجہ ہے جو ترقی و تدریج کے عمل سے گزر کر اپنی موجودہ صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اس کے پس پشت نہ ہی کوئی خالق، ناظم یا مربی ہے جسے اہل مذہب خدا کہتے ہیں۔

اگر یہ اقرار کیا جائے کہ اس کائنات کے پس منظر میں کوئی مربی اور باشعور ہستی کی منصوبہ بندی کارفرما نہیں ہے تو ہمیں لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہ سارا نظام کائنات محض ایک اتفاقی حادثے کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ لیکن سائنس و منطق کی دنیا میں اتفاق کی کوئی عمومی حقیقت نہیں ہے بلکہ یہ ایک بہت ہی منظم حسابی نظریہ (Law of Probability) ہے جس کا اطلاق ایسے امور پر کیا جاتا ہے جن کے وقوع پذیر ہونے کے امکان کے بارے میں ہمارے پاس کوئی معلومات نہیں ہوتی۔ اس قانون کی مدد سے ہم یہ باسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کسی خاص نوعیت کے واقعے کا اتفاقاً پیش آجانے کے امکانات کس قدر ہوتے ہیں۔

مثلاً دس سکے لیے جائیں اور ان پر ایک سے دس تک نشان لگا دیں، اس کے بعد انھیں اپنی جیب میں ڈال کر اچھی طرح ملا دیں۔ اب ان کو ایک سے دس تک بالترتیب اس طرح نکالنے کی کوشش کریں کہ ایک سکہ نکالنے کے بعد ہر بار اس کو دوبارہ جیب میں ڈال دیں۔ یہ امکان کہ نمبر ایک نمبر کا سکہ پہلی بار ہمارے ہاتھ میں آجائے، دس میں سے ایک ہے۔ یہ امکان کہ ایک اور دو نمبر سکہ بالترتیب ہاتھ میں آجائے سو میں ایک ہے۔ یہ امکان کہ ایک، دو اور تین

نمبر سکے سلسلہ وار ہمارے ہاتھ میں آ جائیں ایک ہزار میں ایک ہے۔ یہ امکان کہ ایک، دو، تین اور چار نمبر کے سکے بالترتیب نکل آئیں، دس ہزار میں ایک ہے۔ یہاں تک کہ یہ امکان کہ ایک سے دس تک تمام سکے بالترتیب ہمارے ہاتھ میں آئیں، دس ارب میں صرف ایک ہے۔[1]

یہ سادہ سی مثال ظاہر کرتی ہے کہ واقعات میں امکان اور اتفاق کا تناسب کتنا ہوتا ہے۔ اگر ہم اس عظیم الشان اور منظم کائنات کا جائزہ لیتے ہوئے اس حساب کو دیکھیں تو واضح ہوتا ہے کہ ان کیمیائی عناصر کے مجموعے میں سے اتفاقاً کاربن، ہائیدروجن، نائٹروجن اور آکسیجن کے اتنے ایٹم الگ نکل آنا جن سے صرف ایک پروٹینی سالمہ (Molecule) وجود میں آ جائے، صرف اس ایک سالمے کے وجود کا امکان 10^{160} میں سے ایک بار ہے۔ (10^{160} کا مطلب ہے 10 کو 10 سے 160 مرتبہ ضرب دینا)۔ اس سالمے میں بھی امینوایسڈ بننے کے لیے امکان کا تناسب 10^{48} ہے۔ یہ صرف ایک سالمے کی مثال دی گئی ہے جو کائنات میں ایک ادنیٰ ترین انسان کے جسم میں بھی ایک غیر مرئی شے ہے، اس کا امکان اس قدر کم ہے تو پھر پوری کائنات کو محض ایک اتفاق قرار دینا کیا بے عقلی نہیں؟ مختلف غیر مرئی ذرات سے وجود پانے والے ایک سالمے سے لے کر اجرامِ سماوی اور کہکشاؤں تک ہر ایک کے ظہور پذیر ہونے کو محض ایک "اتفاق" کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زمین، اس کا زاویہ، سورج اور زمین کا فاصلہ، چاند، آکسیجن، ہوا، پانی سب کچھ اس قدر ٹھیک ٹھیک موجود ہے کہ زمین پر حیات ممکن ہو سکے۔ ان میں کسی امر میں 0.5% بھی فرق واقع ہوتا تو زندگی کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ کائنات اس کا Life Friendly ماحول ہونا، یہ سب جدید ریاضیاتی قوانین کے مطابق اربوں میں ایک درجہ امکان رکھتا ہے۔ اگر یہ اتفاق ہی ہے تو ایک شے موزوں ہو، دو شے

---

[1] مولانا وحید الدین خان، مذہب اور جدید چیلنج، صفحہ 82، دار التذکیر ۲۰۰۱ء

موزوں ہو، یہ کیا ماجرا ہے کہ پوری کائنات ہی انسانی حیات کے لیے موزوں ترین صورت میں موجود ہے۔ اتفاق سے کبھی کبھار تو خیر پیدا ہو سکتی ہے لیکن مسلسل خیر کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ان سب حقائق اور ان کے درجہ امکانات کو دیکھ کر کوئی منطقی ذہن یہ باور نہیں کر سکتا کہ تخلیق اور اس میں حیرت انگیز نظم وضبط محض اتفاق کا نتیجہ ہے۔

اگر کائنات کی محض ایک اتفاقی حادثہ ہے اور ہمارے اذہان بھی اسی اتفاقی سلسلے کی ایک کڑی ہے تو جو یہ ساری سائنس کی بنیاد جو انسانی تجربات پر ہے، ان تجربات کو اتفاق کیوں نہیں مان لیا جائے؟ اگر ہم اتفاق پر یقین رکھتے ہیں تو یہ کیوں نہیں مان لیتے کہ سیب زمین پر اتفاق سے ہی گرتا ہے ہوا میں بھی اڑ سکتا تھا، سورج کی روشنی زمین پر اتفاق سے ہی آتی ہے، یہ سب سائنسی دریافت کے متعلق ہم کبھی اتفاق نہیں مانتے تو اتنی عظیم الشان کائنات کے متعلق "اتفاق" جیسے غیر علمی دلیل کا استعمال کیونکر کر سکتے ہیں؟ انسانی عقل اور فکر واستدلال کی سلامتی کا تقاضا یہی ہے اس کائنات کو اتفاق جیسے غیر معقول بات سے جوڑنے کے بجائے خدا کے تصور کو قبول کرلے۔

درحقیقت عقل ومنطق اور سائنس کی شان میں اس سے بڑی گستاخی اور اس بارے میں سب سے بڑی بدذوقی یہی ہوگی کہ اس عظیم الشان کائنات کو محض اتفاق قرار دے دیا جائے۔

حصہ: سوئم

ملحدین کے عمومی سوالات

خدا کا خالق کون؟

یہ اعتراض یا سوال ذہن میں اکثر اٹھتا ہے کہ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خالق ہے، تو پھر خدا کا خالق کون ہے؟ اس معاملے جدید ذہن سخت کنفیوژن کا شکار ہے۔ بالخصوص علت و معلول (Cause & Effect) کی لامتناہی (Endless) بحث کے پیش نظر زمانہ قدیم سے ہی فلاسفہ کے ہاں بحث و مباحثے رائج رہے ہیں، ملحد فلاسفہ اکثر یہ کہتے رہے ہیں کہ اگر مذہبی عقیدے کے مطابق، خدا نے کائنات کو بنایا تو خود خدا کو کس نے بنایا۔ ایک جدید ذہن کے لیے بھی یہ سوال اکثر ذہنی پریشانی کا سبب بنتا ہے کہ ہر چیز کا خالق ہے تو خدا کو کس نے تخلیق کیا۔ مگر فی الحقیقت اس سوال پر معمولی سے ہی غور و فکر سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس طرح کے سوالات اصلاً" منطقی مغالطوں غیر منطقی (illogical) سوال ہے۔

1۔ یہ سوال نہ صرف منطق کی نفی ہے کرتا ہے بلکہ مزید یہ کہ مذکورہ اعتراض ایک کھلی تضاد فکری پر مبنی ہے۔ یہ لوگ خود تو کائنات کو بغیر خالق کے مان رہے ہیں، مگر خالق کو ماننے کے لیے وہ ایک خالق خالق کا مطالبہ کرتے ہیں۔ حالانکہ کائنات کا وجود اگر بغیر خالق کے ممکن ہے تو خالق کا وجود بھی بغیر خالق کے ممکن ہونا چاہیے۔ اگر آپ خدا کے خالق نہ ہونے کی وجہ سے اس کا انکار کرتے ہیں تو پھر لامحالہ آپ کو کائنات کے وجود کا بھی انکار کرنا چاہیے کہ آپ کے نزدیک اس کا کوئی خالق نہیں۔ جب کائنات کو بغیر کسی خالق کے مانا جا سکتا ہے تو

ہر خالق کا وجود بھی بغیر خالق کے ماننا غلط نہیں ہونا چاہیے۔ عقلی اعتبار سے بھی ایک صاحب حکمت اور مدبر ہستی کو خالق ماننا زیادہ معقول ہے بنسبت اس کے کہ ہم بے شعور مادے کو بغیر کسی خالق کے مان لیں۔

2۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر چیز کا کوئی خالق ہوتا ہے تو یہ سوال اس لیے خدا پر لاگو نہیں ہوتا کہ خدا کوئی مادی شے نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر مخلوق کا کوئی نہ کوئی خالق ہے، خدا چونکہ 'مخلوق' نہیں ہے اس لیے اس کا کوئی خالق بھی نہیں ہے۔

3۔ جدید منطق و فلسفہ کا بیان کردہ ایک اہم مغالطہ کیٹیگری مسٹیک (category mistake) کہلاتا ہے۔ یعنی ہر وجود کو ڈیفائن کرنے والی صفات کی وجہ سے اس سے متعلق بعض سوالات از خود ہی غیر متعلق یا غیر منطقی ہو جاتے ہیں جو کسی دوسری صفات کے حامل وجود کے متعلق ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ پوچھنا کہ "یہ انڈے کس درخت میں اُگے؟" بالکل ہی غیر متعلق ہے۔ یا بوتل بنانے والی مشین کے بارے میں پوچھنا کہ یہ مشین کون سی بوتل میں بنی ہے؟ بالکل ہی غیر منطقی ہے۔

اسی طرح خدا ڈیفائن کرنے والی ایک بنیادی صفت الصمد یعنی قائم بالذات اور خالق یعنی تخلیق کرنے والا ہے۔ جب اپنی تعریف میں ہی وہ اس کائنات کا خالق ہے تو پھر اس پر مخلوق ہونے کا سوال کیونکر کیا جاسکتا ہے؟

4۔ ایک اور بڑی غلطی یہ بھی ہے کہ ہم اس معاملے میں کائنات کے اصول علت و معلول کا اطلاق خدا پر کر رہے ہوتے ہیں۔ یعنی اس دعوے کے بعد کہ اگر ہر چیز کی کوئی علت ہے تو خدا کی علت کیا ہے؟ پہلے یہ طے کیا جائے گا کہ کیا کائنات اس اصول علت و معلوم کا اطلاق

خدا پیدا بھی ہوتا ہے؟ تو جواب ظاہر ہے کہ جب خدا نے کائنات بنائی ہے تو اس پر کائنات کے مادی قوانین کا اطلاق نہیں ہوگا۔

۔ ہر چیز کا خالق ہونے، یا علت و معلول کا قانون اس کائنات کے لیے ہے۔ جبکہ خدا اس کائنات کے قوانین سے ماورا ہے۔ لہٰذا اسے قائم بالذات ماننا ضروری اور علت و معلول کا اطلاق اس کے خالق پر کرنا غیر منطقی ہے۔ اس کا وجود کائنات کی ہر حدوں سے ماورا ہے۔

3۔ خدا کے خالق کے بارے میں سوال اس لحاظ سے بھی درست نہیں کہ اس میں ایک متعین وقت میں خدا کے تخلیق ہونے کو فرض کر لیا گیا ہے۔ جبکہ وقت صرف کائنات کا حصہ ہے۔ اور خدا کائنات کا خالق ہے۔ خدا کو موجود ہونے کے لئے کسی وقت کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اس وقت سے ہے جب وقت کا وجود بھی نہیں تھا۔ چنانچہ خدا وجود میں نہیں آیا بلکہ خدا ہمیشہ سے موجود ہے۔

خدا نظر کیوں نہیں آتا

مذہب کا بنیادی مقدمہ ہی یہ ہے کہ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کی زندگی کے طور پر نہیں بنایا۔ یہ چند سالہ زندگی امتحان کے طور پر ہے جس میں کامیابی کی صورت میں ہمیں ہمیشہ کی زندگی نصیب ہوگی۔ اگر اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نظر آتا تو پھر کسی امتحان کی گنجائش موجود نہ رہتی۔ کون ایسا ہوتا جو اللہ تعالیٰ کو دیکھنے اور اس سے گفتگو کرنے کے بعد اس کی نافرمانی کا سوچتا؟ اس دنیا کا امتحان اصل میں نیکی و بدی میں سے کسی ایک کے انتخاب (Choice) کا امتحان ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کا کوئی خالق ہے۔ اسی خالق نے واضح نشانیوں کے ساتھ اپنے رسولوں کو بھیجا ہے۔ اب یہ ہماری عقل کا فیصلہ ہے کہ ہم نے کون سی راہ اختیار کرنی ہے۔ اس بات کا خیال رہے کہ امتحان یہ

نہیں ہے کہ ہم کبھی کوئی گناہ نہ کریں۔ امتحان دراصل یہ ہے کہ ہم مجموعی طور پر اپنی زندگی اپنے رب کے سرکش بندے کے طور پر نہیں بلکہ فرمانبردار بندے کے طور پر بسر کریں۔ اگر اس میں کبھی کوئی کوتاہی ہو جائے تو جذبات کے غلبے سے نجات پاتے ہی سچے دل سے توبہ کریں اور اس کی طرف رجوع کریں۔ جو لوگ اس میں کامیاب ہوں گے، ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں اپنا دیدار کروائے گا اور اپنی جنت میں انہیں شرف ملاقات بھی بخشے گا۔ اُس وقت وہ رب العزت اپنی تمام تر طاقت و کبریائی کے ساتھ سارے عالم کے سامنے ظاہر ہو جائے گا لیکن وہ وقت ایمان لانے کا نہیں نتائج کا ہوگا۔ ہمارے دوست سید اسرار احمد بخاری کہا کرتے ہیں کہ دنیا میں دلیل خدا کی نمائندہ ہے جس کے پیچھے سوائے اخلاقی ذمہ داری کے اور کوئی "طاقت" نہیں کہ جس سے ڈر کر انسان حق کو تسلیم کر لے۔ جو لوگ دلیل کے سامنے اکڑ جائیں اور طاقت کے آگے جھک جائیں ان کا پھر یہی انجام مقدر ہے کہ وہ تا ابد خدا کی "طاقت" کا مزہ چکھیں۔

بن دیکھے خدا پر یقین کیوں؟

بالعموم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سائنسی علم 'ایمان بالشہود' کا قائل ہے، جبکہ خدا کے وجود کو تسلیم کرنے کے لیے 'ایمان بالغیب' لازم ہے۔ اس سے لازمی یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک ہستی حواس خمسہ کی گرفت میں نہیں آسکتی تو ایک عام انسان کو خدا کے وجود پر کیسے قائل کیا جا سکتا ہے؟

اس بارے میں سب سے پہلے تو اس غلط فہمی کو رفع کر لیجیے کہ سائنس صرف 'ایمان بالشہود' ہی کی قائل ہے۔ عصر حاضر میں بہت سی عظیم علمی حقیقتیں جو سائنس نے دریافت کی ہیں، جنہیں پورے اطمینان اور یقین کے ساتھ علمی درس گاہوں میں پڑھایا جاتا

ہے وہ سراسر 'ایمان بالغیب' ہی کا ثمر اور نتیجہ ہیں۔ دوسری بات ہمیں یہ سمجھ لینی چاہیے کہ ایمان بالغیب کے معنی بن دیکھے ماننے کے ہیں' بے سوچے سمجھے' ماننے کے نہیں ہیں۔

ایمان بالشہود یا براہ راست تجربہ و مشاہدے کو ہی حقیقت سمجھنا تجربیت (Positivism) کہلاتا ہے۔ تجربیت کا فلسفہ مغربی عقلیت پسندی کی بنیاد سمجھی جاتی ہے جس کی رو سے چونکہ مذہبی تصورات مثلاً جنت و دوزخ یا خدا ہمارے تجربے اور محسوسات کی دنیا سے باہر ہے اس لیے اس پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ ماضی میں اس نقطۂ نظر کے فروغ نے خدا کے عقیدے کو لوگوں کی نگاہ میں بے دلیل بنا دیا اور بہت سے لوگوں نے اسے علمی اور عقلی اعتبار سے بے بنیاد عقیدہ کہہ کر رد کر دیا کہ خدا کا وجود چونکہ براہ راست مشاہدے میں نہیں آ سکتا تھا چنانچہ یہ کائنات کی ایک فرضی یا خود ساختہ توجیہہ ہے۔

تاہم بیسویں صدی میں صورت حال یکسر تبدیل ہو گئی۔ علم کے پھیلاؤ اور وسعت نے سائنس دانوں کو یہ ماننے پر مجبور کیا کہ شمار علمی حقائق ایسے ہیں جن کا براہ راست مشاہدہ ممکن نہیں ہے، مگر ان کے بالواسطہ اثرات اس قدر واضح اور مبنی بر حقیقت ہیں کہ ان کے وجود سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی ایک بہت بڑی مثال قانون تجاذب law of Gravitation ہے۔ یہ قانون بذات خود بالکل ناقابل مشاہدہ ہے۔ کشش ثقل کوئی مادی شے نہیں ہے جسے کوئی شخص آپ کے سامنے کھڑا کر سکے۔ لیکن اس کے اثرات اس قدر واضح اور حقیقی ہیں کہ اس کا انکار کسی صورت ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح Energy یعنی قوت کو حواس خمسہ کی گرفت میں نہیں لایا جا سکتا، لیکن اس کے کمالات اور کارستانیوں سے سب واقف ہیں۔ آج کی سائنس محسوسات کے قفس سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ سائنسی حلقوں میں آج جتنے بھی نظریات قائم کیے گئے ہیں وہ سب اسی طرح بالواسطہ استنباط پر مبنی ہیں۔

خدا کے عقیدے پر استدلال کی نوعیت بھی یہی ہے۔ اگر آفاق و انفس کی نشانیاں خدا کے عقیدے کی تائید کر رہی ہیں اور ان مشاہدات سے جائز طور پر خدا کے وجود کا استنباط ہو رہا ہو تو یہ عین جدید سائنسی منطق کے مطابق درست اور قابل تسلیم قرار پائے گا۔ اگر ایمان بالغیب یعنی استنباطی استدلال کو صرف اس لیے رد کر دیا جائے کہ وہ براہ راست مشاہدے کی چیز نہیں ہے تو اس سے صرف خدا کا عقیدہ ہی نہیں بلکہ سائنس کا پورا قلعہ زمین بوس ہو جائے گا۔

اسی مسترد شدہ فلسفے کی بدولت مخالفین مذہب دراصل طریق استدلال کو نہ سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہیں۔ وہ مذہب کے ان غیبی امور کو بھی براہ راست (Direct Observation) سمجھنا چاہتے ہیں جس کا تعلق استنباطی استدلال (Inference reasoning) سے ہے۔ مذہب کے ان امور کا تعلق چونکہ غیبیات سے ہے اس لیے اس پہلو کا مطالعہ براہ راست استدلال کے بجائے استنباط کے منطقی اصول سے اسی طرح کر کے مطالعہ کر کے تسلیم کرنا چاہیے جس طرح اس اصول سے آج جدید سائنس کائنات سے متعلق ہونے والی تحقیقات میں ناقابل مشاہدہ امور کو معقول (Valid) سمجھتی ہے۔

قدرتی آفات کیوں آتی ہیں

قدرتی آفات کے متعلق عام مذہبی حلقوں میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ یہ خدا کا عذاب ہیں جو لوگوں پر کثرت گناہ کے سبب نازل ہوتے ہیں۔ میرے محدود علم کے مطابق قرآن و کتب احادیث میں اس کی کوئی دلیل موجود نہیں، اور اس نظریے کی کوئی بنیاد کتب مقدسہ سے ثابت نہیں کی جاسکتی کہ ہر دور میں جو بھی قدرتی آفات ہیں وہ لازماً خدا کا عذاب ہی ہیں۔ قرآن مجید میں جن قوموں کی آسمانی آفات کے ذریعے عذاب کا ذکر

ہے یہ بالکل مختلف صورتیں ہیں۔ قرآن کے مطابق جب پیغمبر کی مخاطب قوم باوجود اس حق کو حق جاننے کے محض اپنی ضد عناد اور ہٹ دھرمی کے سبب رسول کا انکار کرتی ہے، تو انہیں عذاب سے دوچار کیا جاتا ہے۔ یہ عذاب کسی بھی صورت میں ہو سکتا ہے جس میں قدرتی آفات بھی شامل ہیں۔ رسولوں کے باب میں انکار کے بعد سزا کے اس قانون اتمام حجت کہا جاتا ہے، جو خاتم النبیین جناب رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے بعد اب ختم ہو گیا ہے۔

آپ علیہ السلام کے بعد دنیا میں آنے والے حوادث کے بارے "قطعیت" سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اللہ کا عذاب ہی ہیں، کیونکہ اول تو کسی حادثے کی یہ نوعیت جاننے کے لیے کہ وہ اللہ کا عذاب ہیں یا نہیں ہمارے پاس کوئی واسطہ یا ذریعہ موجود نہیں ہے، چنانچہ اس طرح کے واقعات کو آزمائش اور عمومی موت کے تناظر میں لینا زیادہ صائب اور درست بات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زلزلوں اور قدرتی آفات کے نتیجے میں نیکوکار و گناہ گار، امیر و غریب، تنگدست و خوشحال سب متاثر ہوتے ہیں، حتیٰ کہ پیڑ پودے اور بچے بھی لقمہ اجل بن جاتے ہیں اس کی وجہ کوئی عذاب نہیں بلکہ حادثہ ہے۔ جس طرح ایک شخص سڑک کنارے کھڑا ہونے کے باوجود کسی ڈرائیور کی غلطی سے حادثے کا شکار ہو جاتا ہے، اسی طرح ماحولیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے اثرات ہمارے لیے حادثہ بن جاتے ہیں۔ قدرتی آفات کی صورت میں چونکہ بہت ساری اموات ایک ساتھ مجتمع ہو جاتی ہیں اس لیے ہمیں یہ حادثہ بڑا معلوم ہوتا، اور محسوس یہ ہوتا ہے غالبا" اللہ کا کوئی عذاب نازل ہو گیا ہے، ورنہ غور کیجیے تو یہ بڑا حادثہ بھی روز کی اموات کی طرح ایک موت کا واقعہ ہے جس کی زد میں انسان مجموعی طور پر آجاتا ہے۔

خدا کی عبادت کیوں کی جاتی ہے؟

خدا کی عبادت درحقیقت دو پہلوؤں سے اہمیت کی حامل ہے۔

پہلا پہلو انسان کی فطرت کا ہے۔ انسان کے اندر ایک داعیہ شکرانے کا موجود ہے۔ یعنی ایک سلیم الفطرت شخص اپنے محسن کے احسانات کا شکر بجالانا چاہتا ہے اور اگر ممکن ہو سکے تو ان احسانات کا بدلہ اپنی جانب سے کسی اچھے عمل کی صورت میں پیش کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح ایک صالح فطرت شخص ساری کائنات پر غور کرتا ہے اور اسے اپنی خدمت میں لگا ہوا دیکھتا ہے تو بے اختیار ان نعمتوں کے شکرانے کے طور پر اپنی جبین نیاز کو جھکالیتا ہے اور چاہتا ہے وہ اس ہستی کا شکر گزار ہو جس نے اسے یہ نعمتیں فراہم کی ہیں۔

چنانچہ انسان کو اگر خدا کے وجود کا یقین ہو، اس کے خالق ہونے پر ایمان ہو اور وہ اسے اپنا پروردگار بھی مانتا ہو تو وہ اس کا شکر گزار بھی لازماً ہو گا۔ یہی احساسِ شکر گزاری دراصل عبادت کی بنیاد ہے جس کی تسکین اگر نہ ہو تو انسان اپنے جیسی یا بعض صورتوں میں اپنے سے بھی کم تر مخلوق کی عبادت پر مجبور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بندگی کے انہی جذبات کی تسکین کا لازمی تقاضہ ہے کہ انسان خدا کی عبادت کرے۔

دوسرا پہلو دراصل مذہب کے بنیادی مقدمے سے متعلق ہے۔ ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے اور اس نے دنیا میں امتحان کے لیے بھیجا ہے تاکہ انسان جنت کی لازوال نعمتوں سے سرفراز ہو سکے۔ یہ امتحان اس بات کا ہے کہ کون خدا کا بندہ بن کر اپنی روح کو گناہ کی آلائشوں سے پاک رکھتا ہے اور بہترین اعمال کر کے خود کو جنت کا حق دار بناتا ہے۔

اسی امتحان کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہم ہمہ وقت خدا اپنی ذات کو کو مالک کائنات کے سامنے ہمہ تن جھکائے رکھیں اور اس کی مرضی کے مطابق ایک پاکیزہ زندگی بسر کریں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر خیر و شر کا جو حاسہ ودیعت بھی کیا جسے ہم عرف میں ضمیر کہتے ہیں۔ عبادت در حقیقت اس کو طاقت فراہم کرنے کا ایک عمل ہے۔ انسانی جسم کی طرح روح کا بھی ایک مدافعتی نظام ہے عبادت اس نظام کو فعال اور متحرک رکھتی ہے اور ضمیر کے الارم کو کمزور نہیں ہونے دیتی۔ جس طرح جسمانی مدافعتی نظام کی حفاظت نہ کی جائے تو جراثیم حملہ کر دیتے ہیں اسی طرح روحانی مدافعتی نظام کے دفاع سے لاپرواہی برتنے کی صورت میں روح پر شیطانی جراثیم حملہ آور ہو جاتے ہیں جو ضمیر کو کمزور کر دیتے ہیں اور اس کی مزاحمت کی طاقت کم ہونے لگتی اور بالآخر برائی سے روکنے کی قدرتی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ عبادت انسان کے خدا سے تعلق کو مسلسل استوار رکھنے اور اسے خدا کا تقویٰ اختیار کیے رکھنے میں بھی معاون و مددگار ہوتی ہے۔

آخرت میں سزا کی مدت

ملحدین عقیدۂ آخرت پر یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ انسان دنیا کی قلیل سی زندگی میں جرم کرتا ہے، لیکن مذہبی عقائد یہ بتاتے ہیں کہ وہ اس قلیل سی مدت کے گناہوں کے بدلے میں آخرت کی طویل سزا پائے گا جو کہ سراسر ظلم ہے۔ یہ اعتراض دراصل اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ عادلانہ سزا کے لیے جرم واقع ہونے والے وقت اور سزا کے وقت میں نسبت قائم ہونا ضروری ہے یعنی جتنی مدت میں جرم ہوا اتنی مدت تک ہی سزا ہو۔ حالانکہ جرم اور سزا کا تعلق وقت کی نسبت سے نہیں بلکہ اس کے نتیجے میں ہونے والے اثرات ہوتا ہے۔ لہٰذا جرم اور سزا وقت میں یہ نسبت قائم کرنا نہ صرف عقل اور عدل کے خلاف ہے بلکہ اس سے کئی مضحکہ خیز نتائج بھی نکلیں گے۔ مثلاً آپ چوری کے عمل کو دیکھیں؛ چور چند

منٹوں میں چوری کرتا ہے مگر اس عمل کی اسے زیادہ مدت تک کی سزا دی جاتی ہے۔ ایک شخص کسی بم کے ذریعے بہت قلیل وقت میں جتنے انسانوں کا قتل کر سکتا ہے، ماضی میں ظالم بادشاہوں نے اس سے بہت زیادہ وقت لگا کر اس سے کم انسان قتل کیے، تو کیا انھیں زیادہ وقت لگانے کی وجہ سے زیادہ سزا دی جائے گی؟ اسی طرح اس مفروضے پر اور بھی بہت سی مثالیں قیاس کی جاسکتی ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ سزا کے متعلق یہ جرم سے ہونے والے اثرات کو پیش نظر رکھا جائے نہ کہ وقت کو۔

مذاہب میں اختلاف کیوں؟

تعلیم یافتہ لوگوں کی نسبت یہ کہنا درست ہو گا کہ وہ یہ جملہ کہہ کر کہ "سائنسی علوم میں اختلاف نہیں پایا جاتا" دراصل تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ علم کا کوئی سا بھی شعبہ ہو اور علماء کی کوئی سی بھی جماعت، خواہ اس کا تعلق سائنسی علوم سے ہو یا سماجی علوم سے، مذہب سے ہو یا فلسفے سے، معیشت سے ہو یا معاشرت سے، ان میں علمی اختلاف کی حیثیت بنیادی ترین کلید کی ہے۔

ایک مثال Economics کی تعریف Definition ہی کو لیجیے، اس میں بھی اہل علم کے تین گروہ ہیں، کلاسیکل، نیو کلاسیکل اور ماڈرن اکنامسٹس، اور دلچسپ و حیران کن بات یہ ہے کہ تینوں گروہوں کے مابین اکنامکس کی فروعات ہی میں نہیں بلکہ بنیادی تعریف ہی میں بعد المشرقین کا فرق ہے، گویا اکنامکس کیا ہے، صرف اس ایک بنیادی تعریف ہی پر اہل علم کا اتفاق نہیں ہے اور وہ تین مختلف گروہوں میں منقسم ہیں۔

اسی طرح دیگر شعبہ ہائے علم کو یکے بعد دیگرے دیکھتے جائیے، فزکس جیسے خالصتاً مادی سائنس میں بھی مختلف مکاتب فکر موجود ہیں۔ تخلیق کائنات کے بارے میں بھی ایک سے

زائد نظریات مثلاً بگ بینگ، اسٹرنگ تھیوری وغیرہ ہیں۔ سماجی علوم میں سے ہر ایک کے مفروضات و نظریات دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں لہٰذا نہ صرف یہ کہ یہ کبھی متفق الرائے نہیں ہوسکتے، بلکہ پالیسی سازاداروں پر جس کا سیاسی زور چلتا ہے وہ اپنے نظریے سے ہم آہنگ پالیسیاں معیشت و معاشرت پر مسلط کر کے کروڑوں انسانوں کے مستقبل کو اپنے نظریات کی سچائی ثابت کرنے کے لئے تختہ مشق بنادیتا ہے۔

غرض کہ سائنسی علوم میں بھی اختلاف رائے اور مکاتب فکر کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ویسا ہی بے کنار ہے جیسا کہ دنیا کے ہر چھوٹے بڑے مذاہب میں پایا جاتا ہے، اور اس کی وجہ مذہب یا سائنس نہیں بلکہ دراصل انسانی اذہان کا مختلف الخیال ہونا ہے، ایک ہی حقیقت کو دیکھنے او سمجھنے میں ہر دوسرا اہل علم نئے زاویے اور نئے سے نئے خیالات کی بنیاد پر دیکھتا ہے اسے سمجھتا اور بیان کرتا ہے۔

لہٰذا اختلاف رائے اور مکاتب فکر کی کثرت کی بنیاد پر مذہب کی تقصیر و تحقیر کرنا ایک مبنی تعصب رویہ ہے۔ اگر اختلاف کی بنیاد پر مذہب کا انکار کیا جاسکتا ہے کہ تمام سائنسی علوم کا بھی انکار کر دینا چاہیے کیونکہ یہ بھی اختلافات کی زد میں ہی ہیں۔

حصہ: چہارم

ضمیمہ

شہد کی مکھی

ہمارے گرد و پیش مخلوقات میں جانور، انسان، چرند پرند سبھی شامل ہیں۔ ان مخلوقات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان سے ایسی صفات اور حرکات کا ظہور ہوتا ہے جو انتہائی منظم اور پیچیدہ ہیں۔ یہ مخلوقات اس بات کا شعور اچھی طرح رکھتی ہے کہ کس طرح انھیں اپنی نسل کی بقا اور اپنی جان کی حفاظت کرنی ہے۔ موسموں کے تغیر کے مطابق ہجرت، مخصوص علاقے میں انڈے دینا اور واپس لوٹ آنا یہ سب انتہائی حیرت انگیز ہے۔ ان غیر ذی عقل حیوانوں کی تعلیم کے لاکھوں مناظر دنیا میں ہے جس کی ایک ایک واضح مثال شہد کی مکھیوں کا شہد بنانے کا عمل ہے۔

موجودہ دور میں سائنس دانوں (Entomologists) نے نہایت دقتِ نظر کے ساتھ شہد کی مکھیوں کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے۔ اسی مطالعے میں معلوم ہوا ہے کہ اس معمولی سی جسامت کے حامل مگر عجیب و غریب جانور کا اجتماعی طرز حیات کئی حوالے سے انسان کو ورطہ حیرت میں غرق کرنے کے لیے کافی ہے۔ بالخصوص ان کے شہد بنانے کا عمل نہایت ہی منظم اور مربوط ہے۔

شہد کی مکھی شہد بنانے کے عمل کا آغاز پھولوں سے امرت (Nectar) اکٹھا کرنے سے کرتی ہے۔ امرت ایک میٹھا رس ہوتا ہے جو پھولوں میں زیادہ تر شکری مادے سے بنتا ہے۔ مکھیاں اپنی زبان سے یہ رس چوس اپنے پیٹ میں جمع کر کے چھتے تک پہنچاتی ہے۔ چھتے میں ایک اور شہد کی مکھی اس رس کو اپنے منہ میں لے لیتی ہے اور کچھ دیر تک اسے چباتی رہتی ہے۔ اس طرح شہد کی مکھی کے منہ میں موجود کیمیائی مادہ (انزائیم) بھی اِس رس میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد مکھی رس کو چھ کونے والی موم کی خلیوں میں جمع کرتی ہے۔ اب دیگر مکھیاں اپنے اپنے پروں کو پھڑ پھڑا کر ہوا کی حرکت کو تیز کرتی ہے تا کہ شہد میں سے اضافی نمی سوکھ جائے۔ اس کے بعد مکھیاں خلیوں کے منہ کو موم کی ایک باریک تہہ سے بند کر دیتی ہیں۔ اس طرح ذخیرہ اندوزی سے شہد ہزاروں سال تک خراب نہیں ہوتا۔ یہ سارا عمل شہد کو ایک صحت بخش اور دیر پا غذا میں تبدیل کر دیتا ہے۔

عقل و شعور کی حامل ہستی انسان جب اس طرح کا کوئی عمل کرتی ہے تو اس کے پیچھے برسوں کے تجربات کا علم شامل ہوتا ہے۔ آج کا جدید انسان بھی اس طرح کی پیداوار کے لیے بہت سے علوم بالخصوص کیمسٹری کی مدد لیتا ہے۔ ایک وٹامن سپلمنٹ کے پیچھے کئی برسوں کی تحقیق کار فرما ہوتی ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ مکھیوں کے پاس نہ ہی حصول علم کا کوئی ذریعہ ہے اور نہ ہی انسانی عقل اس عمل کو محض کیمیکل ری ایکشن یا اتفاق کہہ سکتی ہے لیکن اس کے باوجود لاکھوں برس سے مکھیاں یہ عمل کر رہی ہیں۔ اس عمل کو قرآن مجید سے اہل فکر کے لیے ایک بڑی نشانی کے طور پر پیش کرتا ہے۔

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِىْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ثُمَّ كُلِىْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِىْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۚ يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ۚ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ

تیرے پروردگار نے (نظام فطرت کے تحت) شہد کی مکھی کو وحی کی کہ پہاڑوں میں، درختوں میں اور جو عرشے لوگ بناتے ہیں ان میں گھر بنانا۔ اور پھر تمام پھلوں سے کھا اور جو راستے تیرے پروردگار نے تیرے لئے معین کئے ہیں ان میں راحت سے چل پھر۔ ان کے بطن سے پینے کی ایک خاص چیز نکلتی ہے اس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں اس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے۔ اس امر میں اہل فکر و نظر کے لئے بڑی نشانی ہے۔ (سورۃ النحل۔ آیت 68-69)

مکھیوں کے اس عمل کی تنہا توجیہہ یہی ہو سکتی ہے کہ انھیں کسی خارجی ذرائع سے ان اعمال کے متعلق ہدایات مل رہی ہیں اور وہ بعینہ ان ہدایات کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انھیں فطری طور پر کسی ایسی ہستی کی رہنمائی حاصل ہے جو فطرت کے کیمیائی قوانین سے واقف ہو۔ بلاشک وہ ہستی ان قوانین کے خالق کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی۔

کائنات کا نظم اور وجود خداوندی

کائنات کے متعلق ملحدین کا یہ نظریہ تھا کہ یہ بے ترتیب (Random) ہے اور اس میں موجود تمام مادے، قوت اور اجرام فلکی ایک اندھے قانون کے تحت چل رہے ہیں جو محض ایک اتفاق سے پیدا ہو گئے۔ لیکن 1900 کے آخری دور میں سائنس دانوں کے سامنے جب کارخانہ کائنات کے مزید قوانین دریافت ہوئے تو انھوں نے یہ مشاہدہ کیا کہ یہ کائنات مکمل نظم اور توازن (Balance) کے ساتھ قائم ہے۔ جس میں معمولی سی تبدیلی بھی یہاں زندگی کے سرے سے معدوم ہونے کے لیے کافی تھی۔ تخلیق کائنات کی توجیہ جو بھی کی جائے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ تمام طبعی، کیمیائی اور حیاتیاتی قوانین نے بالکل اسی

طرح کام کیا جیسا کہ انسانی زندگی کے وجود کے لیے ناگزیر تھا۔ سائنس دانوں نے اس غیر معمولی ڈیزائن کو Anthropic-Principal کا نام دیا۔

سائنس دان مزید کہتے ہیں کہ زمین کا سائز، اس کے جھکاؤ کا زاویہ، سورج اور زمین کا فاصلہ، پانی ، فضا اور دیگر عناصر کی کیمیائی خصوصیات اور کشش ثقل سب کی سب اسی تناسب سے موجود ہے جو انسانی زندگی کے لیے ناگزیر تھا۔ اگر اس سارے نظام میں 0.5٪ بھی فرق واقع ہو جائے تو اس دھرتی پر انسانی زندگی ممکن نہیں ہو سکتی۔ یہ سوال انسان کا ذہن ضرور کرتا ہے کہ ایسا منظم اور مرتب نظام کسی مافوق الفطرت ہستی کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے؟

اس کے بعد بھی کوئی کہتا کہ کائنات کا کوئی ایسا خالق نہیں ہے جس نے یہ سارا نظام قائم کیا ہو؛ بلکہ یہ سب خود بخود قائم ہو گیا تو گویا ایسا ماننا ہے کہ ایک گودام میں دوات اور سیاہی رکھی ہے، اور اچانک ایک دھماکہ کے بعد گودام میں ایک طرف غالب کا دیوان تیار ہو گیا۔!!!

الحاد کی وجوہات اور اس کے سدباب کی حکمت عملی

یورپ میں الحادی فکر کے محرکات اور موجودہ مسلمان

امت مسلمہ اس وقت جس دور سے گزر رہی ہے؛ یہ دور ہماری تاریخ کا مشکل ترین دور ہے۔ سیاسی و معاشی اعتبار سے مغلوبیت علیحدہ، فکری اعتبار سے بھی ہم اقوام عالم سے بہت پیچھے اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔ اب اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ الحاد یعنی مذہب بیزاری کی گمراہی آج صرف مغرب تک محدود نہیں بلکہ یہ ایک عالمی مسئلہ بنتا جا رہا ہے، حتیٰ کہ ہماری مذہب پسند مشرقی تہذیب بھی اس کی لپیٹ میں ہے اور معاشرے میں متعدد افراد کسی نہ کسی درجے میں دہریت کا شکار ہو رہے ہیں۔ الحادی تہذیب آج اپنی پوری شدت کے ساتھ مشرق و مغرب میں اپنا غلبہ حاصل کر رہی ہے اور مگر بدقسمتی سے ہم بحیثیت مجموعی اس حکمت عملی سے اب تک نظر چرائے ہوئے ہیں جس کی مدد سے ہم اس فتنے سے نبرد آزما ہو سکیں۔

حالات کے تناظر میں یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ اس وقت امت کے علماء پر یہ واجب ہے کہ علم و فکر کے میدان میں مجاہد کی طرح اتریں اور اپنے اپنے محاذ کا تعین کرتے ہوئے اس جہاد عظیم میں شریک ہوں تاکہ موجودہ دور کے اس چیلنج کا بھرپور مقابلہ کیا جا سکے۔ اس حوالے سے الحاد کے تدارک کے لیے سب سے پہلی چیز جو اشد ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اس مذہبی فد

ان رویوں کی طرف توجہ دیں جو الحاد کے فروغ کے اہم محرکات بن سکتے ہیں۔ اس ضمن میں محرکات کے تعین اور ان سے آگہی کے لیے یورپ کی مذہبی تاریخ کو سمجھنا بدیہی طور پر لازم ہے تاکہ ہم ان غلطیوں کو دہرانے سے گریز کریں جو الحاد کی پیدائش میں دیگر اسباب کے ساتھ برابر کی ذمہ دار ہیں۔

پندرہویں سے سولہویں صدی عیسوی کا زمانہ تھا جب یورپ میں الحاد نشاۃ ثانیہ کے بعد ایک فکری تحریک کی صورت میں سامنے آیا۔ نشاۃ ثانیہ کے محرکات دسویں صدی جبکہ اس کا متصل دور پندرہویں صدی تھا جب عیسائیت یورپ کا غالب مذہب تھا مگر مذہبی طبقے نے اپنے رویوں میں ایسی کوئی کسر نہ چھوڑی تھی کہ لوگ مذہب سے بیزار نہ ہوں۔ اس تاریخ سے جو بنیادی عوامل الحاد کے فروغ کے ضمن میں ہمارے سامنے آتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ مغرب میں الحاد اور جدیدیت در آنے کی پہلی وجہ مذہبی رہنماؤں کا وہ طبقہ تھا جن میں بے شمار اخلاقی خرابیاں اور شدت پسندی پیدا ہو چکی تھیں۔ پادری خورشید عالم کہتے ہیں کہ کلیسا کی روحانی اور اخلاقی حالت دن بدن ابتر ہو رہی تھی اور پوپ صاحبان کا اخلاقی کردار بالکل گر چکا تھا۔[1] زناکاری، تعصب، کرپشن، باہمی بد اخلاقی، تعیشات پسندی اور مذہبی تکبر ان میں بالکل عام تھا۔ ان خرابیوں نے مذہب کا حلیہ بھی بگاڑ رکھا تھا اور بہت سے اخلاقی رذائل کو بھی کلیسا بالخصوص پوپ کی جانب سے بھی مذہبی پشت پناہی حاصل تھی۔ مارٹن لوتھر پروٹسٹنٹ فرقے کے بانی اور ان سنجیدہ مذہبی لوگوں میں سے تھے جن کی جانب سے مذہبی رہنماؤں کی اصلاح کا مطالبہ ہمیشہ کیا جاتا رہا مگر ان کا مطالبہ جب بے نتیجہ رہا تو ردعمل میں پروٹسٹنٹ تحریک کا ظہور ہوا جو درحقیقت یورپ کے مجموعی نظام فکر میں جدیدیت کا پہلا بیج تھا۔

---

[1] ڈاکٹر نادر رضا صدیقی، **تاریخ کلیسا** (پاپائیت اور اس کی سرگزشت)، ص: 116

۲۔عیسائیت میں باہمی فرقہ وارانہ نضانے بھی الحاد کے فروغ میں ایک اہم محرک کے طور پر اپنا کردار ادا کیا ہے۔نشاۃ ثانیہ سے قبل عیسائی علماء کی محفلوں کے موضوع عجیب وغریب اور عملی زندگی سے غیر متعلق موضوعات ہوا کرتے تھے۔ اور ان مباحث پر ہونے والے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے باہمی اختلافات محض علمی اختلافات نہیں بلکہ تنازع کی شکل اختیار کرچکے تھے اور دونوں فرقے ایک دوسرے باہم برسرپیکار ہوچکے تھے۔جب کبھی جس فرقے کے ہاتھ میں طاقت آتی وہ دوسرے فرقے کو کچلنے کی کوشش کرتا۔یہ معاملہ دسویں صدی عیسوی سے قرونِ وسطیٰ تک جاری رہا۔عماد الحسن فاروقی لکھتے ہیں:

"۱۰۵۴ء میں روم اور قسطنطنیہ کے مراکز نے ایک دوسرے کو خارج از امت قرار دے دیا اور اُن کے اپنے اپنے حلقۂ اثر سے متعلق تمام عیسائی مراکز اس فیصلے میں شریک ہوگئے۔ اُس وقت سے قسطنطنیہ کے مرکز نے یونانی راسخ العقیدہ کلیسا کے نام سے اپنے آپ کو الگ عیسائی امت بنالیا اور عقائد اور رسوم ورواج کے خفیف سے اختلاف کے علاوہ' رومی کیتھولک کلیسا سے تعصب کو اپنا شعار بنالیا۔ اس کے بعد جب صلیبی جنگوں کے دوران ۱۲۰۴ء میں رومن کیتھولک فوجوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرلیا اور وہاں زبردستی رومن کیتھولک مسلک کو رائج کرنے کی کوشش کی تو فریقین کے درمیان تنفر اور اختلافات کی بنیاد مستقل ہوگی۔"[1]

[1] عماد الحسن فاروقی۔ دنیا کے بڑے مذاہب۔ صفحہ ۳۱۷۔ مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور ۱۹۹۰ء

سولہویں صدی کے وسط سے سترہویں صدی کے وسط تک کا زمانہ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کلیسا کے درمیان تنازع لِلبقا سے عبارت ہے۔[1] اس تنازع اور مذہبی جنگ میں کلیسا کے ہم قدم ان کے بادشاہ بھی شریک تھے اور کلیسا کے حکم پر جنگوں سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔

"کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کلیسا کی حمایت میں یورپ کے ریاستی حکمرانوں اور بادشاہو کے درمیان جو صف بندی ہوئی، اس نے جہاں پروٹسٹنٹ کلیسا کو ایک مستقل حیثیت اختیار کرنے میں مدد دی، وہاں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ریاستوں کے درمیان ایک ایسی جنگ کا آغاز کیا جو تقریباً ایک سو سال تک جاری رہ کر سترہویں صدی عیسوی کے وسط میں ہی جا کر ہی ختم ہو پائی۔"[2]

اس صورت حال میں کئی متفکر اذہان مذہب کی اس باہمی چپقلش سے پریشان تھے۔ چنانچہ اس دور کے مذہب مخالف فلسفی اور مفکرین مذہبی اختلافات اور فرقہ واریت پر شدید تنقید کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لاینحل مذہبی اختلافات اور تکفیری مہم سے بیزار افراد نے الحاد کی راہ اختیار کی کیونکہ یہی وہ دامن تھا جہاں انھیں کسی تکفیر کا خوف نہ تھا۔

۳۔ کلیسا کا مطالبہ تھا حکومت میں ان کا مذہبی اثر ورسوخ ہر حال میں ہونا چاہیے اور تمام تر فیصلے ان کی صوابدید پر ہونے چاہیے جبکہ بادشاہ محض ایک مخصوص دائرے میں ہی مذہبی طبقے کو قبول کرنے پر راضی تھے۔ اس صورت حال میں پوپ یعنی کلیسا اور پولیٹیکل لیڈر شپ کے درمیان اختلاف اور تنازعات شروع ہو گئے تھے۔ شہنشاہوں اور پوپوں کے درمیان وقتاً فوقتاً کشمکش جاری رہتی تھی۔ کبھی شہنشاہ مذہبی مجلس کے ذریعے سے پوپ کی معزولی کا انتظام

---

[1] عماد الحسن فاروقی۔ دنیا کے بڑے مذاہب۔ صفحہ ۳۲۰۔ مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور ۱۹۹۰ء

[2] ایضاً

کرالیتا، کبھی مقامی باشندے زور پکڑ کر شہنشاہ کے مقرر کیے ہوئے پوپ کو باہر نکال دیتے۔ حتیٰ کہ پوپ انوسینٹ سوم (۱۲۱۶ء) کے دور میں پاپائیت ایک مستحکم نظام بن چکا تھا۔ ڈاکٹر نادر رضا صدیقی اس صورت حال پر لکھتے ہیں:

> "یورپ کے بادشاہوں اور پوپوں میں آئے دن کشمکش رہنے لگی۔ اگر بادشاہوں کو موقع ملتا تو وہ پوپوں کے خاص علاقوں اور جاگیروں کو تباہ و برباد کر دیتے، پائمال کرتے اور اپنی رعایا سے کہتے کہ یہ مذہبی پیشوا نہیں بلکہ دجال ہیں۔ دوسری جانب پوپ بادشاہوں سے اس طرح بدلہ لیتے کہ ان کو دائرہ مذہب سے ہی خارج کر دیتے۔ کسی بادشاہ یا کسی اور شخص کو بلکہ کسی پورے ملک کو کلیسا سے خارج کر دینا تقریباً روز کا معمول تھا۔"[2]

پوپ کے بڑھتے ہوئے اقتدار کی ہی وجہ سے اکثر بادشاہوں نے ایسی صورت میں پروٹسٹنٹ تحریک کی سرپرستی کی اور نتیجتاً کلیسا جو ایک مضبوط روایت پسند ادارہ تھا، سیاسی اثر و رسوخ کی کشمکش کی نذر ہو گیا۔ روایت پسندی کے زوال میں پروٹسٹنٹ کے فروغ نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس تحریک نے دوسرے حکمرانوں کو بھی موقعہ دیا جو اپنی بادشاہتوں کو پوپ کے کنٹرول سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔[3] پاپائیت کا یہ زوال واضح طور پر پندرہویں صدی کے بعد سے مختلف خطوں میں ٹھیٹھ جمہوریت اور سیکولرازم کے معاہدوں کی صورت میں سامنے آیا جس نے اجتماعی سطح پر الحادی نظام فکر کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔

---

[1] ولیم ایل لینگر۔ انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم۔ ترجمہ: مولانا غلام رسول مہر۔ صفحہ ۴۰۰۔ الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰

[2] ڈاکٹر نادر رضا صدیقی، تاریخ کلیسا (پاپائیت اور اس کی سرگذشت)، ص:612

[3] عماد الحسن فاروقی، دنیا کے قدیم و جدید مذاہب۔ صفحہ ۳۰۴۔ تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۶

۴۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے منسوب اناجیل مسیحی دور کے آغاز کا یہ مجموعی منظر بیان کرتی ہے کہ یہودی فقہاء / فریسی مذہب کی اخلاقی و روحانی تعلیمات کے بجائے ظواہر پرستی میں مبتلاء ہو گئے تھے۔ ان کا سارا زور مذہب کی ظاہری ہیت اور مذہبی حلیے کی بقا پر تھا۔ ان میں اس بات کی اہمیت تھی کہ کھانے سے قبل ہاتھ دھو لیے جائیں یا عبادت کرتے ہوئے فلاں فلاں عمل و حرکت بالکل اسی حساب سے کی جائے جس طرح ان کے علماء نے لکھا ہے۔ چنانچہ اہم ترین اخلاقی و روحانی تعلیمات بالکل بے مقصد ہو کر رہ گئی تھی۔ اس رویے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے شدید تنقید کی تھی جس کی شہادت ہم انجیل اربعہ میں دیکھ سکتے ہیں، مگر یہ رجحان بدستور یہودیوں میں موجود تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں سیدنا مسیح کے نام لیوا بھی اس ظاہر پرستی کے مرض کا شکار ہو چکے تھے۔ مذکورہ صورت حال اس کی واضح ترین مثال ہے جہاں مذہب کو انفرادی زندگی میں لاگو کرنے کے بجائے اجتماعیت میں مذہبی طبقے کو مسلط کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ مذہب کی اصل روح اوجھل ہونے اور ظاہر پرستی کے رواج نے کئی حساس ذہنوں کو مذہب کے مخالف کر دیا کیونکہ ان کے لیے ایسا خدا اور مذہب بالکل بے سود تھا جو محض چند ظاہری اعمال پر انسانی زندگی اور اس کی آخرت کو موقوف کر دے۔

۵۔ تیرہویں صدی سے پہلے یونانی فلسفے کو کم و بیش وہی حیثیت حاصل تھی جو آج جدید سائنس کو حاصل ہے۔ عیسائی ماہرینِ الٰہیات یونانی فلسفے کے اس سحر میں بری طرح مبتلاء تھے چنانچہ انھوں نے جو علم الکلام تیار اس پر افلاطون اور اس کے بعد نو افلاطونی مکتب فکر کا اثر بہت نمایاں تھا۔[1] عیسائی دانشوروں نے اپنے عقائد کی تشکیل، ان کی تشریح و تعبیر اور ان کے حق میں پیش کیے جانے والے کو یونانی فلسفے اور کونیاتی نظریات کو خاص نظر میں رکھا اور اسی کی روشنی میں اپنے مذہب کی حقانیت ثابت کرنے کی علمی سعی کی۔ یونانی فلسفے کی مدد سے

---

[1] مولف: ایڈون اے برٹ، فلسفہ مذہب، مترجم بشیر احمد ڈار، صفحہ ۹۷، مجلس ترقی ادب۔ لاہور، ۲۰۰۹

عیسائی متکلمین اپنے دین کا اثبات کیا کرتے تھے اور اس کے لیے انھوں نے یونانی نظریات کو مذہب کی تشریح و توضیح اور حقانیت کے ثبوت کے لیے استعمال کیا تھا۔ مگر نشاۃِ ثانیہ کے دور میں جب یونانی فلسفے پر ضرب کاری کا آغاز ہوا تو ساتھ ہی عیسائیت پر بھی لوگوں کا ایمان متزلزل ہونا ناگزیر نتیجہ تھا۔

۶۔ کلیسا کے علماء کتبِ مقدسہ کی تفہیم کو اُس فکر کے تابع رکھنا چاہتے تھے جو ان کے پادریوں نے یونانی، یہودی اور رومی فکر سے اخذ کر کے مرتب کی تھی۔ ان کے ہاں موسوی شریعت کی اصل کے بجائے اس شریعت کی خود ساختہ تفہیم کو دین کا درجہ دے دیا گیا جس سے اختلاف ان کے نزدیک مذہب سے اختلاف تھا۔ مذہبی متون اپنی تحریف شدہ حالت میں بھی جس قدر آزادیٔ فکر فراہم کر رہے تھے، ان پر لگائے گئے حاشیوں نے اس آزادی پر قدغن لگا دی۔ چنانچہ جب گلیلیو نے جب زمین کے متحرک ہونے کا نظریہ پیش کیا تو عیسائی علماء کے نزدیک یہ بائبل کے خلاف تھا۔ حالانکہ اصلاً یہ اس خود ساختہ تفہیم کے خلاف تھی جو حقیقتاً انسانی تحریفات کا نتیجہ تھیں۔ یہی وہ فکر تھی جس نے کلیسا کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے فہم کے مخالف مفکرین کو کڑی سے کڑی سزائیں دیں۔ جان وینی، گلیلیو، کوپرنیکس اور برونو جیسے کئی اہل علم کو کلیسا کی جانب سے عبرت ناک سزائیں دی گئیں۔ علم و عقل کے علم بردار مفکرین جب ظلم کا شکار ہوئے تو یہ ظلم مذہب بیزاری کے رجحان پر منتج ہوا کیونکہ عملی طور پر ان کے سامنے یہ مثال، واضح تھی کہ مذہب اور سائنس باہم متصادم ہے حالانکہ یہ تصادم اصل مذہب کے بجائے اس کی تفہیم سے متعلق تھا۔

۷۔ مذہب اور سائنس کے اختلافات پیدا ہوتے ہی مفکرین کا ایک ایسا گروہ سامنے آیا جس نے اس مخاصمت کا حل یہ پیش کیا کہ مذہب اور سائنس کو بالکل علیحدہ رکھا جائے۔ مثلاً فرانسس بیکن کا کہنا تھا کہ مذہب کی بات بھی مانو اور خدا کو بھی تسلیم کرو۔ چاہے ہماری عقل

س کو تسلیم نہ کرتی ہو اور خدائی قانون کی پابندی کرو خواہ ہمارا ضمیر اس کو بوجھ محسوس کرے۔[1] اس سیکولر نظریے نے مذہب اور سماجی علوم کو اس طرح علیحدہ کیا کہ اس صدی میں ایک سائنسی علوم کا ایک پورا ذخیرہ تیار ہوا جو بالکل بے خدا (Godless) تھا۔ اخلاقیات اور معیشت و معاشرت کے متعلق ایسے فلسفے پیش کیے جس میں مذہب اور آسمانی ہدایت کو بالکل باہر کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ ہر چیز حتیٰ کہ کائنات اور خود مذہب کے سرچشمے کی توجیہہ بھی مادی نقطہ نظر سے کی جانے لگی۔ اس بے خدا علوم کے ذخیرے نے علمی سطح پر الحادی فکر کی راہ ہموار کی اور الحاد کو نام نہاد سائنسی بنیادیں فراہم کیں۔

انفرادی نوعیت کی وجوہات سے قطع نظر یہ وہ بنیادی عوامل تھے جن کا تعلق براہ راست مذہبی طبقے سے تھا اور انہی عوامل نے مغرب میں الحاد کو پنپنے کا سماجی جواز فراہم کیا۔ غور کریں تو آج ہم بھی کم و بیش اسی رویے کو اپنائے ہوئے ہیں جس کا اظہار یہود اور عیسائی اقوام نے نشاۃِ ثانیہ سے قبل کے دور میں کیا۔ آج ہمارے ذہن بھی فرقہ واریت سے آلودہ ہیں، اور ہماری اخلاقی حالتِ زار بھی پوپ سے کسی طرح کم نہیں ہیں جو تمام تر برائیوں کے باوجود اپنے تئیں خود کو پاک دامن اور متقی گردانتے تھے۔ دین کی تفہیم پر ہونے والی تنقید کو دینی انحراف سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس بنیاد پر گستاخی، جدت پسندی اور کفر کے فتوے، حتیٰ کہ واجب القتل قرار دینے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ مذہب و سیاست کی باہمی چپقلش آج بھی اسی طرح جاری ہے اور ہم نے بھی غیر متغیر کلام الٰہی کو ثابت کرنے کے ہر لحظہ بدلتی ہوئی سائنس کو معیار بنالیا ہے۔

---

[1] مولانا امین احسن اصلاحی، فلسفے کے بنیادی مسائل، صفحہ ۶۹، فاران فاؤنڈیشن لاہور، ۲۰۱۲

یہ سب ہمارے لیے غور و فکر کا مقام ہے کہ اگر ہم نے بھی مذہبی و فکری اعتبار سے اسی طرح کا کردار ادا کیا جو اس دور میں کلیسا کا تھا، تو کوئی مانع ہیں کہ آئندہ کے حالات ہمارے لیے انتہائی مایوس کن ہوں گے۔

مذہب بیزاری کی وجوہات اور اس کے تدارک کی حکمت عملی

الحاد کے تدارک کی حکمتِ عملی کے ضمن میں ضروری ہے کہ لوگوں کو ایک ہی طرز پر دعوت دینے کے جائے ان کے مزاجوں اور طبائع کے فرق اور جدید ثقافتی و نفسیاتی رجحانات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے متنوع طریقے سے انہیں مذہب کی طرف مائل کیا جائے۔ اس سلسلے میں الحاد کی تاریخ دیکھنے کے بعد اگر ہم اسی تاریخ کے پس منظر میں الحاد کی وجوہات تلاش کرنے کی کوشش کریں تو وہ حسب ذیل سامنے آتی ہیں۔

مذہبی و معاشرتی حالات

مذہب کی مخالفت کا ایک اہم عنصر سماجی ہوتا ہے۔ بعض لوگ جس معاشرے میں رہتے ہیں وہاں کے مذہبی حالات درست نہیں ہوتے۔ ان میں غیر عقلی اور شدت پسندی کے رجحانات کو مذہبی تعلیمات میں شامل کیا جاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ مذہب ہی برا ہو بلکہ ممکن ہے مذہبی رہنماؤں کی جانب سے اس کی غلط تشریح و تفہیم کی گئی ہو۔ اس کی وجہ سے انسان کلی طور پر ہر مذہب کو اسی مذہب کی طرح گمان کرتا ہے اور مذہب کا منکر ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے وہ کسی ایسے مذہب کا پیروکار ہو جو عقل و فطرت کے مسلمہ اصولوں کے خلاف ہو، ایسی صورت میں بھی بعض حضرات تمام مذاہب کو یکساں طور پر باطل مان لیتے ہیں۔

بچھ معاشروں میں مذہبی شدت پسندی یا پھر کوئی ایسا معاشرتی بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے جس کے ستضذمہ دار کسی نہ کسی طرح مذہبی رہنما سمجھے جاتے ہیں مذہبی رہنماؤں کی اخلاقی حالت اس سلسلے میں کافی اہمیت کی حامل ہے۔ اگر مذہبی رہنماؤں کی اخلاقی حالت مخدوش ہو تو بعض وگ اسی بنیاد پر مذہب کے ہی مخالف ہو جاتے ہیں کیونکہ انہیں لگتا ہے کہ مذہب پر ایمان ہی سماجی مسائل اور حالات کی ذمہ دار ہے۔ عام طور پر اسی صورت میں سیکولرزم کی فکر پیدا ہوتی ہے۔

سماجی و معاشرتی وجوہات کی بنیاد پر اور بالخصوص مذہبی رہنماؤں کے منفی کردار یا مذہب کی غیر عقلی اور شدت پسندانہ تعبیر کی بنیاد پر الحاد کی راہیں اختیار کرنے والوں کو مذہب کی جانب مائل کرنے کے لیے سب سے اولین ضرورت تو یہ ہے کہ اُن کے سامنے مذہب کی درست تفہیم و تشریح پیش کرنے کی کوشش کی جائے اسی کے ساتھ انہیں اس جانب متوجہ کیا جائے کہ چند بُرے لوگوں کے اعمال اور اُن کی بداخلاقی کسی مذہب یا پوری مذہبی فکر کی نمائندگی نہیں کرتی چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اچھے اور باکردار لوگ مذہب اور اہل مذہب کی نمائندگی کرنے کے لیے آگے آئیں اور انہیں اس بات پر قائل کیا جائے کہ وہ مذہب کی صحیح نمائندگی کے لیے بجائے مذہب سے بیزار ہونے کے از خود بھی آگے بڑھ کر اس کی نمائندگی اپنے اچھے کردار اور اخلاق سے کر سکتے ہیں۔

شخصی وجوہات

نفس پرستی

بعض لوگوں میں مذہب سے ذاتی طور پر بیزاری پائی جاتی ہے کیونکہ وہ اپنی خواہشات کی پیروی کرنا چاہتے ہیں اور مذہب چونکہ کئی اخلاقی جرائم پر پابندی عائد کرتا ہے لہذا وہ مذہب کو اس سلسلے میں رکاوٹ سمجھتے ہوئے اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس ضمن میں مزید غور کیا جائے تو مزاج کا یہی عنصر عصر حاضر میں آزادانہ جنسی تعلقات سمیت کئی اخلاقی برائیوں مثلاً" ہم جنس پرستی کی ایک وجہ ہے۔

ملحدین کے اس گروہ کی اصل ضرورت دین کی روحانی دعوت کا پیش کرنا ہے یعنی انہیں اسلام کے روحانی نظام سے نہ صرف علمی طور متعارف کرایا جائے بلکہ عملی ماحول سے جوڑنے اور صالحین کی صحبت کا اہتمام بھی کیا جائے جس کی بدولت ان کی شخصیت میں اخلاقی برائیوں سے بچنے کا حقیقی محرک پیدا کیا جاسکے۔

عقلی و نظریاتی وجوہات

الحاد کے فروغ میں نظریاتی عوامل کا بھی ایک اہم اور بہت بڑا کردار ہے۔ بعض لوگوں کے ذہن میں دوسروں کی باتیں سن کر یا بعض نفسیاتی کمزوریوں کے سبب از خود ہی شبہات اور شکوک پیدا ہوتے ہیں اور وہ جلد ہی نفسیاتی طور پر اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں اگر تجزیہ کرنے کی صلاحیت کا فقدان ہو یا پھر وہ کسی بناء پر تجزیہ کرنے کے عادی نہ ہوں تو ان کا ذہن اسی مناسبت سے کئی قسم کے شکوک و شبہات کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور چونکہ وہ اپنی کنفیوژنز کا جواب نہیں تلاش کر پاتے تو وہ مذہب کی مخالفت کرنے لگتے ہیں۔

تجزیے کی صلاحیت سے محروم ایسے ہے لوگوں میں سے بعض جن کا میدان تخصص سائنس ہو وہ سائنسی مضامین کی مخصوص علمی اپروچ اور طرزِ استدلال کا مطالعہ کرتے ہوئے جب مذہب کی تعلیم اور سائنسی حقیقت میں مطابقت نہیں دیکھتے تو مذہب کی صداقت کے بارے میں ان کے دل کا یقین متزلزل ہونے لگتا ہے۔ اکثر مذاہب میں موجود غیر عقلی عقائد بھی اس کی ایک اہم مثال ہیں جسے وہ عقل کے خلاف دیکھتے ہیں تو کلی طور پر تمام مذاہب کے ہی مخالف ہو جاتے ہیں۔

ایسے لوگوں کی حقیقی ضرورت اسلام کے عقائد اور افکار کو عقلی بنیادوں پر ثابت کرنا ہے، سائنس اور فزیکل سائنسز کی محدودیت، خلافِ عقل اور ماورائے عقل امور میں فرق سمجھانا اور مذہب کے وجود کو فطرت و وجدان کی پکار کا جواب ثابت کرنا ہے۔

ہر آدمی ایک سی ذہنی استعداد کا حامل نہیں ہوتا چنانچہ مخاطب کی ذہنی استعداد اور علمی گہرائی کا ٹھیک سے اندازہ لگاتے ہوئے جوابات دیے جانے چاہئیں۔ مذہب اور سائنس دو الگ الگ میدان ہیں جہاں تمام ہی چیزوں کو ایک سے طرزِ استدلال پر ثابت نہیں کیا جاسکتا لہذا مذہب کے طرزِ استدلال کی گہرائیوں اور فکری بالیدگی کو درست طرز پر پیش کرنا یہاں اصل چیلنج ہے۔

موروثی الحاد

بعض لوگوں کے والدین ملحد ہوتے ہیں جن کی تربیت میں رہتے ہوئے بچے بھی ملحد بن جاتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہونے والا شخص ہندو ہی ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ غور و فکر کے بعد مذہب تبدیل نہ کرلے۔

ملحدین کے اس گروہ کی اصل ضرورت دین کی مکمل دعوت اور اُن کے مزاج کی رعایت رکھتے ہوئے اُن کے افکار کا علمی جواب مہیا کرنا ہے۔ ہر انسان کسی نہ کسی فکر یا فلسفے کو اپنی زندگی میں سب سے اوّلین اہمیت دیتے ہوئے اُسی کی بنیاد پر اپنے اخلاقی وجود کی تعمیر کرتا ہے، چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس گروہ کے لوگوں کے افکار کا گہرا علمی مطالعہ کیا جائے، فلسفہ و جدید علوم سے واقفیت حاصل کی جائے اور اُن کے اخلاقی رجحانات کو دیکھتے ہوئے اُن تک خُدا کے دین کی دعوت پہنچائی جائے۔

مغربی تہذیب سے مرعوبیت

بعض لوگ مغربی ممالک کی مادہ پرستانہ تہذیب کی کامیابی اور مادی ترقی سے اس قدر مرعوب ہو جاتے ہیں کہ مغرب سے آنے والے تمام افکار کو سینے سے لگانا کامیابی کی کلید سمجھ لیتے ہیں۔

ایسے لوگوں کو جو بات سمجھانا سب سے اوّلین ضرورت ہے وہ یہ کہ وہ سب سے پہلے تو مغرب میں اہلِ مذہب کی ناکامیوں کی وجوہات کا مطالعہ کریں مزید یہ کہ مذہب مغربی ممالک میں حکومت و سرکاری معاملات سے نکل جانے کے باوجود بھی بڑے بڑے سائنسدانوں اور مفکرین کی ذاتی زندگیوں میں پوری آب و تاب سے موجود رہا ہے۔ یعنی سیاسی شکست کے باوجود مذہب اور مذہبی عقائد وہاں کے لوگوں میں بالعموم موجود ہیں۔

مغرب کی وہ بڑی شخصیات جن کے علمی کارناموں کے سبب مغرب نے ترقی کی ان کی اکثریت مذہب کے ماننے والوں کی ہے جن میں سے نمایاں نام البرٹ آئن اسٹائن، آئزک نیوٹن اور چارلس ڈارون وغیرہ ہیں۔ اسی طرح مغرب میں جن سماجی و سائنسی علوم کو بامِ عروج حاصل ہوا اُن کی بنیاد مسلمان یعنی مذہب پسند اہلِ علم نے رکھی۔ مثال کے طور پر

جابر ابن الحیان بابائے کیمیاء، ابن خلدون بابائے سماجیات، ابو القاسم زہراوی جدید سرجری کے بانی، الخوارزمی جدید الجبراء کے بانی کہلاتے ہیں وغیرہ ایسے بہت سے نام ہیں جنہوں نے بے شمار علمی کارنامے انجام دیے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ مذہبی لوگ بھی تھے۔

چنانچہ مذہب اگر سائنسی و مادی ترقی کے خلاف ہوتا تو یہ تمام تر علمی شخصیات مذہب کے ماننے والی نہ ہوتی۔

ختم شد

- جدید الحاد: یورپی تصورِ حیات کا پہلا قدم اور آخری منزل
- جدید الحاد: یورپی ''تلاش حق'' کا اصل نتیجہ
- جدید الحاد: روحِ مغرب کی تہذیبی بنیاد
- جدید الحاد: تہذیبِ مغرب اور اُس کے علوم کا حاصل
- جدید الحاد: جدید مغربی شعور اور داخلی انفس کے احوال کا منظرنامہ
- جدید الحاد: تہذیبِ مغرب کا علمِ بے اماں
- جدید الحاد: روحِ مغرب کا علمی آئینہ
- جدید الحاد: تہذیب مغرب کا محیط علم
- جدید الحاد: مغربی علوم کا قلبِ ظلمات اور روشن چہرہ

کتاب محل

دربار مارکیٹ لاہور 0321-8836932

kitaabmahal786@gmail.com

kitabmahal 03004827500